الرسالہ
Al-Risala

November 1994 • Issue 216 • Rs. 6

اپنے آپ کو بدل لیجئے،
آپ کے حالات خود بخود بدل جائیں گے۔



The Great Mosque, Damascus, completed in 715 A.D.

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر، اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۴ ، شمارہ ۲۱۶

ضروری اعلان

الرسالہ کی قیمت دسمبر ۱۹۹۴ سے ۷ روپیہ فی شمارہ ہوگی۔

مینجر الرسالہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

ایمان میں نقصان

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم اولٰئک لهم الامن وهم مهتدون (الانعام ۸۲)

جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی نقصان نہیں ملایا انھیں کے لیے امن ہے اور وہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ظلم سے مراد نقصان ہے۔ لغت عرب میں ظلم کا یہ مفہوم آتا ہے (لسان العرب) اور خود قرآن میں اس کا استعمال موجود ہے۔ سورہ الکہف میں دو باغ کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ دونوں باغ خوب سرسبز وشاداب تھے۔ دونوں اپنا پھل لائے اور اس میں کچھ نہیں گھٹایا (الکہف ۳۳)

اس دنیا میں ہر فائدہ والی چیز کے ساتھ نقصان کا پہلو لگا ہوا ہے۔ مثلاً تجارت ایک مفید چیز ہے۔ لیکن ایک تاجر اگر ایسا کرے کہ وہ تجارت کرنے کے ساتھ بری عادتوں میں بھی اپنے کو پھنسا لے۔ وہ اپنی پوری بکری کو اپنا نفع سمجھ لے۔ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ دادا گیری کرنے لگے۔ وہ اپنے اصحاب معاملہ سے وعدہ خلافی اور بددیانتی کا سلوک کرے۔ جو تاجر ایسا کرے وہ بہت جلد دیوالیہ ہو جائے گا، ایسا تاجر کبھی کامیاب تاجر نہیں بن سکتا۔

یہی معاملہ ایمان کا ہے۔ ایمان بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر ایمان کو اس کے نقصانات سے بچانا ہے۔ جو آدمی اپنے ایمان کو اس کے نقصانات سے نہ بچائے اس کا ایمان اس کو نفع پہنچانے والا نہیں۔

ایمان کا نقصان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق آئے مگر وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ اس سے گناہ سرزد ہو مگر وہ توبہ نہ کرے۔ وہ اپنی توحید میں شرک کی ملاوٹ کر دے۔ اس کو امانت سونپی جائے تو وہ اس میں خیانت کرنے لگے۔ ایک عمل خیر اس کی استطاعت میں ہو مگر وہ اس کو انجام نہ دے۔ خدا کے دین کو وہ اپنے لیے سامان تجارت بنالے۔ وہ ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرے جس کو اس نے انجام نہیں دیا۔ اس قسم کی تمام چیزیں ایمان میں نقص پیدا کرنے والی ہیں، اور جس ایمان میں نقص شامل ہو جائے وہ ایمان خدا کے یہاں قابل قبول نہیں۔

منافق کی پہچان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں منافقت کی پہچان کے بارہ میں کچھ روایتیں آئی ہیں۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ وہ روایت یہ ہے :

اربعٌ مَن کنَّ فیہ کانَ منافقاً خالصاً۔ إذا ائتُمِنَ خانَ ۔ وَ اذا حدَّثَ کذَبَ۔ و اذا عاھدَ غدَرَ و اذا خاصَمَ فجَرَ۔ و إن صامَ وصلّیٰ و زعَمَ أنّہ مُسلِمٌ ۔

چار خصلتیں جس میں ہوں وہ پورا منافق ہے۔ جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وہ وعدہ کرے تو اس سے پھر جائے اور جب وہ بحث کرے تو انصاف سے ہٹ جائے۔ خواہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو باہمی معاملات پیش آتے ہیں ان کی مختلف صورتیں ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں وہ چار ہیں۔ آدمی کی اندرونی شخصیت کیسی ہے اس کا اظہار ان پہلوؤں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک قسم کا اظہار آدمی کے مخلص ہونے کی پہچان ہے اور دوسرے قسم کا اظہار آدمی کے منافق ہونے کی پہچان۔

مال اور جائداد کے سلسلہ میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کی چیز دوسرے انسان کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اب جو آدمی دوسرے کی چیز کو حق دار کے حوالے نہ کرے بلکہ اس پر خود قبضہ کرنے لگے وہ ایسا کرکے اپنے آپ کو منافق ثابت کر رہا ہے۔

یہی معاملہ قول کا ہے۔ ایک آدمی اگر اپنے قول میں محتاط نہ ہو، وہ بات کرے تو اس میں جھوٹ ملا دے تو ایسا آدمی اللہ کے نزدیک منافقین میں شامل ہے۔

اسی طرح ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان بسا اوقات معاہدہ کی صورت پیش آتی ہے۔ اب جو شخص معاہدہ تو کرلے مگر معاہدہ پورا کرنے کا وقت آئے تو اس کو پورا نہ کرے تو وہ حقیقت کے اعتبار سے منافق ہے۔

مومن بااصول انسان کا نام ہے اور منافق بے اصول انسان کا نام۔

محفوظ دوری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد سے فرمایا کہ تم لوگ زمین پر آباد ہو اور تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنو گے (بعضکم لبعض عدو) اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ امتحانی دنیا میں انسان کو جن حالات کے درمیان رہنا ہے ان میں ایسا بھی ضرور ہونا ہے کہ لوگوں میں اختلاف اور مقابلے جاری ہوں جو بڑھ کر عداوت تک پہنچ جائیں۔ حتی کہ قتل و خون کی نوبت آجائے۔ ایسا ہونا خود تخلیقی منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس لیے اس کو ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ درخت سے کانٹے کو ختم کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لیے کیا کیا جائے۔ کیونکہ لڑائی اور ٹکراؤ کے درمیان صحت مند زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ صحت مند زندگی بنانے کے لیے معتدل حالات کی موجودگی لازمی طور پر ضروری ہے۔

اس کا جواب خود خالق حقیقی نے پیشگی طور پر دے دیا ہے۔ اور وہ صبر و اعراض ہے۔ عداوت کی اس دنیا میں کامیاب زندگی بنانے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ٹکراؤ کے مواقع سے اعراض کیا جائے۔ اشتعال انگیزی اور ناخوش گواری اور ضرر رسانی کے تجربات پیش آئیں مگر ان کو نظر انداز کیا جائے۔ زیادہ فائدہ کی خاطر کم نقصان کو برداشت کر لیا جائے۔

جنگل کے جانوروں میں بھی عداوت کا یہی اصول کارفرما ہے۔ پھر جنگل کے جانور کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ کرتا ہے کہ فطرت کی رہنمائی کے تحت وہ اپنے آپ کو اپنے دشمن یا حریف کے مقابلہ میں محفوظ فاصلہ (safe distance) پر رکھتا ہے۔ یہی واحد فطری اصول ہے جس پر جنگل کی زندگی کروروں سال سے قائم ہے۔

محفوظ دوری پر رہنے کا یہ اصول فطرت کا اصول ہے۔ اسی کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ سڑک پر آپ اپنے کو دوسری گاڑیوں سے محفوظ دوری پر رکھتے ہیں، اسی لیے آپ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچتے ہیں۔ یہی اصول گھر کے لیے، بازار کے لیے، اجتماعی زندگی کے تمام مواقع کے لیے ضروری ہے۔ ہر جگہ ہمیں اپنے آپ کو دوسروں سے محفوظ دوری پر رکھنا ہے۔ اس دنیا میں یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کا حصول ممکن نہیں۔

انسانی فطرت

ابوالبرکات صاحب (نظام پور، اعظم گڑھ) سے ۲ دسمبر ۱۹۹۱ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انھوں نے مندرجہ ذیل واقعہ بتایا۔

ضلع اعظم گڑھ میں ماہل کے قریب ہندوؤں کا ایک گاؤں ہے۔ اس کا نام ٹکریا (Tikurya) ہے۔ پڑوس کے گاؤں رسول پور سے ایک یادو چوری کی غرض سے یہاں پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ایک گھر کے پاس پہنچ کر اس نے اس کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ بھی ایک یادو کا گھر تھا۔ اس نے اپنی بھانجی کی اپنے یہاں پرورش کی تھی۔ اس وقت صرف بھانجی گھر میں تھی۔ اس کا ماما (ماموں) کسی ضرورت سے باہر چلا گیا تھا۔

کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سن کر لڑکی دروازہ پر آئی۔ اس نے سمجھا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ تصدیق کے لیے اس نے اندر سے کہا "ماما!" باہر کے آدمی نے یہ سن کر کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ مگر جب دروازہ کھلا تو سامنے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ آخر کار وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ لڑکی دوبارہ دروازہ پر آئی اور تصدیق کے لیے پھر کہا کہ ماما!۔ باہر سے آواز آئی کہ ہاں۔ اب لڑکی نے دوبارہ دروازہ کھول دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ ابھی دونوں دروازہ ہی پر تھے کہ لڑکی نے کہا کہ اس سے پہلے آپ دروازہ کھلوا کر کہاں چلے گئے تھے۔ ماما نے کہا کہ میں تو اس سے پہلے نہیں آیا۔ لڑکی نے کہا کہ پھر کون تھا جس نے اس سے پہلے کنڈی کھٹکھٹائی۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ ماما نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں چور ہوں۔ ماما نے دوبارہ کہا کہ جب تم چور ہو تو دروازہ کھلنے کے بعد اندر گھس کر اپنا کام کیوں نہیں کیا۔ چور نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جب لڑکی نے اندر سے پوچھا کہ ماما۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ہاں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے آپ کو لڑکی کا ماما بنا دیا۔ اور ماما کبھی کسی بھانجی کے گھر میں چوری نہیں کر سکتا۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (صفر ۱۴۱۴ھ) میں کرسٹوفر کولمبس (۱۵۰۶-۱۴۵۱ء) کے بارہ میں ایک تحقیقی مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے : لماذا أخطأ کولمبس (کولمبس نے کیوں غلطی کی ؟) اس کے لکھنے والے دکتور منظر صلاح الدین شعبان ہیں۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے :

فی الفترۃ الممتدۃ من القرن الثامن و حتی القرن الثانی عشر کانت اللغۃ العربیۃ ھی لغۃ العلوم لغالبیۃ الجنس البشری۔ ولھذا السبب فقد اعتبر کولمبس اللغۃ العربیۃ ام جمیع اللغات۔ وھذا یفسر سبب اصطحابہ معہ فی رحلتہ الاولی الإسبانی لویس دی تور الذی یتقن العربیۃ مترجما خاصا لہ (صفحہ ۳۰)

آٹھویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ میں عربی زبان ہی دنیا کے بیشتر لوگوں کی علمی زبان تھی۔ اور اسی بنا پر کولمبس نے عربی زبان کو تمام زبانوں کی ماں قرار دیا اور اسی سے اس کا سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنے پہلے سفر میں ایک اسپینی لوئی دی تور کو خصوصی مترجم کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا جو کہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھا۔

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس طرح آیا ہے ـــــ کولمبس چوں کہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جہاں جارہا ہے وہاں اس کو وحشی لوگ ملیں گے یا مہذب لوگ، اس نے اپنے جہازوں پر سستے اور معمولی سامان لادلیے تاکہ وہ وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کا سونا حاصل کرسکے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایک شخص لوئی دی تور کو اپنے جہاز میں بٹھایا جو کہ ایک یہودی تھا اور وہ عبرانی اور کلدانی کے علاوہ کچھ عربی زبان بھی جانتا تھا، اس ضرورت کے پیش نظر کہ وہاں "عظیم خان" سے اس کی ملاقات پیش آجائے :

As Columbus did not know whether he was to come across new savages or old civilizations, he loaded his ships with cheap merchandise to relieve aboriginals of their gold, but also took on board one Luis de Torres — "who had been a Jew and knew Hebrew and Chaldeand a little Arabic" — in case he met the "grand khan". (4/938)

یہ اس دور کی بات ہے جو پانچ سو سال پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عربی زبان کا وہی مقام تھا جو آج انگریزی زبان کا مقام ہے۔ اس وقت عربوں کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج اہل مغرب کو حاصل ہے۔ اس وقت عالمی واقعات کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی جس طرح آج وہ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ تبدیلی کسی سازش کی بنا پر پیش نہیں آئی۔ بلکہ تمام تر فطرت کے قانون کے تحت پیش آئی۔ اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ جس کو جو کچھ ملے گا استعداد کی بنا پر ملے گا اور جس سے جو کچھ چھنے گا بے استعدادی کی بنا پر چھن جائے گا۔ اس دنیا میں جو لوگ محروم رہ جائیں انھیں دوسروں کی سازش یا تعدی کا انکشاف کرنے کے بجائے اپنی بے استعدادی کو ختم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر وہ کچھ پائیں گے تو اپنی بے استعدادی کو ختم کر کے ہی پائیں گے۔ شکایت اور احتجاج کی بنیاد پر یہاں انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے کسی خاص نسل یا کسی خاص گروہ کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں کسی ایک انسان کا جو حق ہے وہی دوسرے تمام انسانوں کا حق بھی ہے۔ یہاں کوئی چیز صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو فی الواقع اس کے حق دار ہوں۔

حق دار کون ہے۔ قرآن کے مطابق، حق دار وہ ہے جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہو۔ قرآن میں فطرت کا ایک مستقل اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے (واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض) :

and that which is for the good of mankind remains on the earth

یہی اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ابدی قانون ہے۔ یہاں قیام واستحکام صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جو دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو۔ کسی قوم کی زبان ہو یا اس کی حکومت، کسی قوم کا کلچر ہو یا اس کی اقتصادیات، کسی بھی چیز کو صرف اس وقت تک زمین کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل ہوگی جب کہ اس میں دوسروں کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ نفع بخشی کی صلاحیت کھوتے ہی وہ اپنا غالب مقام بھی کھو دے گی۔

اصل مسئلہ

مولانا شکیل احمد قاسمی (۳۸ سال) مدرسہ امداد الاسلام ،میرٹھ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک تجربہ بتایا جو نہایت سبق آموز ہے۔

انھوں نے کہا کہ نومبر ۱۹۹۲ میں صدر بازار (میرٹھ) کے ایک تعلیم یافتہ ہندو مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا ان کے مدرسہ میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے دو لڑکوں، گورو اہلو والیا اور چارلی اہلو والیا کو اُردو اور عربی زبان پڑھانا چاہتا ہوں۔ آپ ان کے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دیں۔ مولانا قاسمی نے پوچھا کہ آپ ان بچوں کو اُردو، عربی کیوں پڑھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچوں میں کھُلا ذہن پیدا ہو۔ وہ تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر سوچنے والے بنیں۔ واضح ہو کہ مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا کا تعلق آر ایس ایس سے ہے اور وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایکٹو ممبر ہیں۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے سوچا کہ اگر میں مدرسہ کے کسی طالب علم کو اس کام پر مقرر کروں تو شاید وہ ٹھیک سے اس کو انجام نہ دے سکے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی اس کام کو کریں گے۔ انھوں نے جب مسٹر اہلو والیا سے یہ بات کہی تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ تاہم مولانا قاسمی کے اصرار پر انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اب انھوں نے پوچھا کہ مولانا صاحب، ہم کو ماہوار کتنا دینا ہوگا۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ کچھ نہیں۔ یہ تو میرے لیے ایک خوشی کا کام ہے۔ میرے لیے یہی قیمت کافی ہے کہ ایک ایسے حلقہ میں جہاں اُردو ختم ہو رہی ہے وہاں کچھ لوگ اُردو اور عربی جاننے والے پیدا ہو جائیں گے۔ غرض کچھ دیر کی بحث کے بعد طے ہو گیا کہ مولانا قاسمی ان کے گھر پر جا کر ان کے بچوں کو اردو پڑھایا کریں گے۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈر سے ان بچوں کو اردو پڑھانا شروع کیا۔ یہ سلسلہ یکم دسمبر ۱۹۹۲ کو شروع ہوا اور اب تک وہ بدستور جاری ہے۔ اس مدت میں ان ہندو بچوں نے کئی ریڈریں ختم کر لی ہیں۔ وہ اب صحیح املا لکھ لیتے ہیں اور اُردو اخبار (مثلاً قومی آواز) کو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اب انھوں نے منہاج العربیۃ کے ذریعہ سے عربی پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت وہ منہاج العربیۃ کا دوسرا حصہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے گھر میں اُردو کا اتنا چرچا ہوا کہ اب خود مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیہ نے بھی مولانا قاسمی سے اردو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے اردو

کتابوں کے علاوہ بازار سے ضخیم فیروز اللغات بھی خرید لی ہے تاکہ اردو سیکھنے میں وہ ان کے لیے معاون ہو سکے۔

اس تعلیم کا مزید اثر یہ ہوا ہے کہ اہلو والیا فیملی میں "اردو تہذیب" آنا شروع ہو گئی ہے۔ وہ لوگ گفتگو میں ان شاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا حافظ جیسے الفاظ کو استعمال کرنے لگے ہیں۔

مسٹر اہلو والیہ ہر طرح مولانا شکیل احمد قاسمی کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کے ساتھ تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مثلاً مسٹر اہلو والیہ ایک ہندو علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا قاسمی جب ان کے یہاں سے پڑھا کر نکلتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو ان کے ساتھ دور تک بھیجتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اجنبی محسوس نہ کریں۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ کیا ہے۔ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ "ہندو فرقہ واریت" نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ ہندو مسلم دوری ہے۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی بھی ذریعہ سے ملنا جلنا شروع ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے اور قربت سے دوستی پیدا ہوتی ہے۔ عام تجربہ ہے کہ جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری آئی وہاں ساتھ ساتھ غلط فہمیاں بھی آگئیں۔ اور جہاں میل ملاپ بڑھا وہاں اپنے آپ ایک دوسرے سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا، اس وقت زراعتی زندگی کے تحت فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بار بار ملنے کی صورتیں پیدا ہوتی تھیں۔ آزادی کے بعد ہندستان میں صنعتی دور آگیا۔ صنعتی دور کے تقاضے کے تحت خاندان منتشر ہو گئے۔ لوگ ادھر اُدھر جانے لگے۔ اس طرح مشترک زندگی کا نظام ٹوٹ گیا۔ پچھلے تعلقات باقی نہیں رہے۔ موجودہ زمانہ میں دونوں فرقوں میں دوری کا بڑا سبب یہی ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیمی اداروں میں جائیں۔ جدید اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ کر حصہ لیں۔ نیز اس انداز کے کام بھی کریں جس کی ایک مثال مولانا شکیل احمد قاسمی کا مذکورہ واقعہ ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دوبارہ میل ملاپ کا سابقہ دور واپس آجائے گا۔

خاموشی

ارنسٹ سیاچری (Ernest Psiachari) ایک فرانسیسی رائٹر ہے۔ وہ ۱۸۸۳ میں پیرس میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ابتداءً آزاد خیال اور ملحد تھا۔ مگر بعد کو وہ مسیحی عقیدہ کی طرف لوٹ آیا اور خدا اور مذہب کو ماننے والا بن گیا۔

ارنسٹ سیاچری مشہور مؤرخ ارنسٹ ریناں کا پوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سمجھا جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۱۴ سے پہلے فرانس میں روحانی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے —— خاموشی آسمان کا ایک ٹکڑا ہے جو زمین پر اتارا گیا ہے :

Silence is a bit of heaven that comes down to earth.

خاموشی فطرت کی زبان ہے۔ ایک آدمی جب خاموش ہوتا ہے تو وہ عالم فطرت کا ہم زبان بن جاتا ہے۔ اس کی سطح وہ ہو جاتی ہے جو فطرت کی سطح ہے۔ اور فطرت کی سطح سے بلند سطح اور کوئی نہیں۔

انسان مطلق معنوں میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسان جب بظاہر خاموش ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسروں کے لیے خاموش ہوتا ہے مگر اپنے لیے خاموش نہیں ہوتا۔ وہ خارجی دنیا کی طرف سے خاموش ہو کر اپنی داخلی دنیا سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔

چپ رہنا ایک عظیم عمل ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ "زمین" کی باتوں سے زیادہ "آسمان" کی باتوں پر دھیان دے رہا ہوتا ہے۔ وہ انسان سے زیادہ فرشتوں کی سرگوشیوں پر کان لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ خود اپنی بات کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ سطحی اور ظاہری باتوں سے زیادہ گہری حقیقتوں کی دریافت میں مشغول ہوتا ہے۔

آدمی جب بولتا ہے تو وہ محدود دنیا میں ہوتا ہے، آدمی جب چپ رہتا ہے تو وہ لامحدود دنیا کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔

خاموش جواب

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب (حیدرآباد) اپنے خط مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ میں لکھتے ہیں :
قرآن مجید کی تلاوت کے دوران سورہ النساء کی آیت ۱۴۰ اور سورہ الانعام کی آیت ۶۸ نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ دونوں میں تقریباً یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات کے متعلق بے ہودہ باتیں کرتے ہیں تو تم ان سے منہ پھیر لو۔ یہاں تک کہ وہ ان باتوں کے سوا دوسری باتوں پر غور و خوض شروع کر دیں۔

ان آیات میں تو بظاہر مسلمانوں کو ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن سورہ الانعام کی آیت ۶۸ میں فاعرض عنہم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفین کے منہ کو نہ لگیں کہ اس سے بات بڑھ کر رائی سے پہاڑ بن سکتی ہے۔

ان آیات میں آج کی "سیاست ملی" کے لیے کھلا حکم موجود ہے ——— مخالف کو "چپ کرنے" سے وہ چپ نہیں ہوتا۔ بلکہ "چپ رہنے" سے اسے مجبوراً چپ ہونا پڑتا ہے۔
مولانا حالی نے اسی بات کو اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں اس طرح بیان کیا :

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ ۔۔۔ سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ عقل اور نقل دونوں کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ غیر سنجیدہ باتیں کریں۔ جھوٹے الزام لگائیں۔ طنز، تعریض، تنقیص پر اتر آئیں، ایسے لوگوں کا جواب صرف اعراض ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔

اعراض کوئی منفعل روش نہیں۔ وہ فریق ثانی کا خاموش جواب ہے۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ بعض اوقات خاموش جواب بولنے سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

اعراض کی پالیسی بے عملی کی پالیسی نہیں، وہ پورے معنوں میں ایک عمل ہے۔ بلکہ اکثر اوقات زیادہ نتیجہ خیز عمل۔ اگر آپ مخالف کی بات کا جواب دیں تو وہ دوبارہ اس کا جواب دے گا۔ اس طرح نزاع باقی رہے گی۔ مگر جب اس کی بات کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ مجبور ہو کر کسی اور کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح نزاع اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔

ماضی کا ایک صفحہ

انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (جاری شدہ ۱۸۳۸) میں روزانہ اس کے قدیم فائل سے کوئی ایک شائع شدہ خبر نقل کی جاتی ہے۔ اس کے شمارہ ۱۸ جون ۱۹۹۴ میں اس کالم کے تحت وہ خبر نقل کی گئی ہے جو اخبار مذکورہ کے شمارہ ۳۱ مئی ۱۸۷۵ میں چھپی تھی۔ اس خبر کا عنوان تھا ——

مزید یورپی کا قبول اسلام :

More European converts to Islam

اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ بنگلور میں یورپی لوگ اکثر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے مطابق ۱۹ مئی ۱۸۷۵ کی صبح کو جب ایک ٹرین بنگلور اسٹیشن پر رکی تو اس سے چار یورپی افراد برآمد ہوئے۔ وہ اسٹیشن کے باہر آکر کینٹونمنٹ کے علاقہ میں جنرل بازار کی ایک مسجد میں پہنچے۔ وہاں بہت سے مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مولوی سے کرائی گئی جو حیدرآباد سے بلایا گیا تھا۔ اس مولوی نے کلمہ پڑھا کر ان چاروں کو اسلام میں داخل کیا۔ ان کے نام کی تفصیل یہ ہے :

Captain J. Colin Campbell, 31	Muslim name:	Mahomed Abdoolah
Francis O'Neill, Irish sailor, 20		Abdool Lateef
W. Elder, Irish sailor, 21		Abdoolah
F. White, German sailor, 20		Abdoos Salam

خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ ان نومسلموں میں سے دو آدمی اس کے بعد السور (Ulsoor) گئے۔ وہاں انھوں نے ایک انگریز اورسیر کے پندرہ سالہ لڑکے کو آمادہ کیا کہ وہ بھی انھیں کی طرح اسلام قبول کرلے۔ اس کو راضی کرکے وہ اسے ایک مسجد میں لے گئے۔ مگر مسجد کے ذمہ داروں نے اس کو اسلام میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لڑکا ابھی نابالغ ہے، اگر اس کے باپ کو معلوم ہوا تو وہ ہم کو پریشان کرے گا۔ مگر نومسلموں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد انھوں نے خود ہی لڑکے کا بال مونڈا اور اس کو محمڈن مذہب میں داخل کرلیا۔

انیسویں صدی کے مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کو اسلام کا دشمن قرار دے کر ان سے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ مگر اسلام دین فطرت ہے، اگر نفرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو ہر ایک کو اسلام اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگے گا۔

ایرانی انقلاب

جون ۱۹۹۲ کے آغاز میں ایران کے صدر ہاشمی رفسجانی نے اپنے دفتر میں ایرانی مہاجرین کی ایک جماعت سے ملاقات کی۔ وہ لوگ ترک وطن کے کئی سال بعد اعلیٰ تعلیم کی وزارت کی دعوت پر ایران آئے تھے۔ زائرین میں سے ایک صاحب جو کہ ایٹمی تحقیق کے میدان میں بین اقوامی ماہر سمجھے جاتے ہیں، ان سے رفسجانی نے پوچھا کہ اپنے سابق وطن ایران کے بارہ میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ صدر کے سوال کے جواب میں ایرانی مہاجر نے جو الفاظ کہے وہ آج کل ایران میں لوگوں کے درمیان بہت گردش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: میں نے ملک میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دیکھی، سوا اس کے کہ شاہ اب عمامہ پہنتا ہے اور اس کے آدمیوں نے بھی اپنے لباس بدل لیے ہیں۔ نائٹ کلب سڑکوں سے منتقل ہو کر گھروں کے اندر چلے گئے ہیں، اور نفاق ایک معمول کی چیز بن گیا ہے۔ بلکہ جو شخص جتنا زیادہ مصنوعی دین داری دکھاتا ہے وہ اتنا ہی بڑا منصب حاصل کرتا ہے۔ حاضرین مجلس کے تعجب اور اضطراب کے درمیان صدر رفسنجانی نے مذکورہ شخص سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں:

في بداية الشهر الماضي استقبل الرئيس الايراني هاشمي رفسنجاني في مكتبه مجموعة من المغتربين الايرانيين ممن كانوا يزورون ايران بعد سنوات عديدة من الغربة بدعوة من وزارة التعليم العالي. سأل رفسنجاني احد زواره الذي يعتبر خبيرا دوليا في مجال البحوث الذرية، عن انطباعاته خلال زيارته للوطن. وجاء رد المغترب الايراني على سؤال الرئيس في عبارة تتردد حاليا في ايران بين الناس، فقال: لم اشاهد تغيرا اساسياً في البلاد سوى ان الشاه يلبس العمامة ورجاله بدّلوا ألبستهم، والنوادي الليلية انتقلت من الشوارع الى داخل البيوت، والنفاق اصبح أمراً عادياً، بل ان من يتظاهر بالتدين اكثر فانه يحصل على منصب أعلى. ووسط استغراب وربما قلق بعض الذين حضروا الاجتماع قال الرئيس لزائره انه على الحق. (المجلة، لندن، ٢٢-٢٨ يوليو ١٩٩٢)

یہی ہر اس سیاسی انقلاب کی بات ہے جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر لایا جا رہا ہے۔ اسلامی انقلاب ہمیشہ دعوت اور کردار سازی اور صابرانہ جدوجہد اور تدریج کے اصول پر برپا ہوتا ہے۔ جب بھی سیاسی ہنگامہ آرائی یا گن کلچر کے ذریعہ انقلاب لانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا انجام ایران جیسا ہوگا، خواہ اس کا نام اسلامی انقلاب یا آسمانی انقلاب کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

سطحی اعتراض

ایک ہندو بھائی ہیں۔ وہ الرسالہ (اردو) کو ہر مہینہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ الرسالہ کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اور تو سب اچھا ہے۔ اس میں بہت سی اخلاق اور مذہب کی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر ایک بات مجھے کھٹکتی ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ میں الرسالہ ہمیشہ ہندوؤں ہی کو برا کہتا ہے۔

پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو آپ الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ الرسالہ میں تو کبھی ہندوؤں کے خلاف کچھ نہیں چھپتا۔ اس میں تو ہمیشہ مسلمانوں کو صبر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ہندو بھائی نے جواب دیا: یہی تو ہندوؤں کو برا بتانا ہے۔ کیوں کہ صبر کسی ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ جب الرسالہ مسلمانوں سے صبر کرنے کے لیے کہتا ہے تو یہ بات اس میں اپنے آپ شامل ہے کہ ہندو ان کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ اگر کوئی مسلمانوں کے اوپر ظلم نہ کر رہا ہو تو صبر کی بات کہاں سے آئے گی۔

میں نے اس واقعہ کو سنا تو میں نے کہا کہ ہمارے مخالف مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو زیادہ گہرائی کے ساتھ الرسالہ کو پڑھتا ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ الرسالہ کے مخالف ہیں، ان کا خاص اعتراض یہ ہے کہ الرسالہ میں ہمیشہ مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے اور ان سے صبر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے خلاف الرسالہ میں کچھ نہیں ہوتا۔

حالاں کہ مسلمانوں سے صبر کرنے کے لیے کہنا بذات خود یہ معنی رکھتا ہے کہ دوسرا فریق ان کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ صبر کرو (الاعراف ۱۲۸) تو اس میں یہ بات لازمی طور پر شامل تھی کہ فرعون یا اس کی قوم تمہارے اوپر ظلم کر رہی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں تمہیں جوابی تشدد نہیں کرنا ہے۔ بلکہ صبر کرتے ہوئے اللہ کی مدد کا انتظار کرنا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کی مخالفت کرنے والے کتنے سطحی لوگ ہیں۔ انھیں گہری حقیقتوں کی خبر نہیں۔ ان کے اعتراضات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنی سطحیت کو الرسالہ کے اوپر انڈیل رہے ہیں۔

کتنے جاننے والے ایسے ہیں جنھوں نے اب تک کچھ نہیں جانا۔

سنّت اجتہاد

رسول کا زمانہ ، صحابہ کا زمانہ اور تابعین کا زمانہ اسلام کی تاریخ میں معیاری زمانہ ہے۔ اس کو پیغمبر کی حدیث کی بنا پر قرون مشہود لہا بالخیر کہا جاتا ہے۔ یہ گویا اسلام کا دور اول ہے۔ اسی دور اول کی روشنی میں بعد کے زمانوں کو جانچا جائے گا، نہ کہ بعد کے زمانہ کی روشنی میں دورِ اول کو جانچا جانے لگے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ دور اول میں اسلامی فقہ موجودہ فنی صورت میں پائی نہیں جاتی تھی اور نہ اس کی باقاعدہ تدوین ہوئی تھی۔ مدوّن فقہ کا آغاز خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں ہوا۔ دور اول کی فقہ سادہ اور فطری اسلوب پر تھی۔ بعد کے زمانہ میں اس میں تعمق اور تقصّی اور تقسیم کا اضافہ ہوا۔ اس طرح فطری فقہ نے ایک فنّی فقہ کی صورت اختیار کرلی۔

فنّی فقہ کو سمجھنے کے لئے ایک سادہ مثال لیجئے۔ ایک شخص نے ایک مفتی سے طلاق کے بارہ میں سوال کیا۔ سوال یہ تھا کہ فریقین کے درمیان اگر مسلک کا اختلاف ہو، یعنی ایک حنفی ہے اور دوسرا غیر حنفی، ایسی صورت میں قاضی کیا فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ کس طرح ان کے اوپر نافذ ہوگا۔ مفتی نے جواب دیا ——— امور مجتہد فیہا میں فقہاء نے قاضی کے فیصلہ کو رافع خلاف قرار دیا ہے۔

یہ کسی سوال کے جواب کا فنّی انداز ہے۔ یہ انداز بعد کے زمانہ میں رائج ہوا۔ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں جواب کے لئے اس انداز کا رواج نہ تھا۔ اس مخصوص اسلوب کو اگر علم فقہ کا لازمی جزء سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد یہی ہوگا کہ اگر اس فنی اسلوب میں کمال رکھنے والے لوگ موجود نہ ہوں تو کہنے والے کہیں گے کہ فقہی غور و فکر کا دروازہ بند کردو، کیوں کہ اب اس کے اہل افراد دنیا میں پائے نہیں جاتے۔

اس تفنین نے فطری دین میں غیر فطری مسائل پیدا کر دئے۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ تھا کہ شریعت میں استدلال کی بنیاد کیا ہو۔ اس میں فنی خوض کرکے فقہاء نے چار اصول وضع کئے ———

عبارت النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غیر ضروری تدقیق ہے۔ اس چار کو ہم سادہ طور صرف دو میں بیان کر سکتے ہیں۔ یعنی منصوص استدلال اور استنباطی استدلال۔ جو استدلال براہ راست کسی نص صریح پر مبنی ہو، وہ منصوص استدلال ہے۔ اور جو استدلال کسی نص سے مستنبط کیا جائے وہ استنباطی استدلال۔

اجتہاد کے معاملہ میں بھی اسی طرح کی تدقیق کر کے اس کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اسی مصنوعی پیچیدگی نے چوتھی صدی ہجری میں یہ ذہن پیدا کیا کہ اب ہمیشہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ کیوں کہ اجتہادی صلاحیت کے لوگ دنیا میں باقی نہیں رہے۔ حالاں کہ اجتہاد کو اگر اس کے فطری مفہوم میں لیا جائے تو اس کا دروازہ بند ہونے کی بات بالکل بے معنی نظر آئے گی۔ کیوں کہ اجتہاد محض ایک شرعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ضرورتِ حیات ہے۔ اجتہاد دراصل استنباط ہی کی اعلیٰ صورت ہے۔ اور استنباط ایک ایسی انسانی ضرورت ہے جس سے کسی بھی حال میں اور کسی بھی معاملہ میں مفر ممکن نہیں۔

قدیم زمانہ میں، اقتصادی معاملات (commercial transactions) کے لئے سونے اور چاندی کے سکے کا رواج تھا جن کا نقل وحمل سخت مشکل تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کاغذی نوٹ کا عمومی استعمال شروع ہوا جس نے اس مسئلہ کو نہایت آسان بنا دیا۔ اس وقت دہلی میں مولانا عبدالحق حقانی موجود تھے۔ کسی آدمی نے مولانا سے فتویٰ پوچھا کہ نوٹ کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ مولانا نے جواب دیا: میرا فتویٰ نہیں چلے گا۔ مگر نوٹ چل جائے گا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اجتہاد کس طرح ایک ضرورت حیات ہے۔ اور جو چیز ضرورت حیات کی حیثیت رکھتی ہو وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک خود حیات باقی ہے۔ نہ اس کا دروازہ بند ہونے کا سوال ہے اور نہ اس کی کنجی گم ہونے کا۔

اجتہاد کا لفظ جُہد سے بنا ہے۔ جہد کے معنی کوشش کے ہیں اور اجتہاد کے معنی زیادہ کوشش کے ہیں۔ اجتھد فی الامر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے فلاں معاملہ میں انتہائی کوشش کی۔ اس میں اس نے اپنی پوری صلاحیت استعمال کر ڈالی۔ شریعت کے مسائل میں جب اجتہاد کا لفظ بولا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، اپنی پوری کوشش صرف کر کے متعلقہ معاملہ میں

شرعی حکم معلوم کرنا۔

مجتہد کی دو بڑی تقسیم کی گئی ہے۔ مجتہد مقید، مجتہد مطلق۔ مجتہد مقید وہ ہے جو پیش آمدہ حالات میں مروجہ فقہی مسالک میں سے کسی مسلک کا پابند رہ کر فتویٰ دے۔ وہ اپنے اختیار کردہ مسلک سے باہر نہ جائے۔ مثلاً فقہ حنفی میں ایک مجلس کی تین طلاق کو تین مانا جاتا ہے۔ اب مسلک حنفی سے وابستہ مجتہد اسی کی پیروی میں فتویٰ دے گا، وہ کسی حال میں اس سے باہر نہیں جائے گا۔

مجتہد مطلق وہ مجتہد ہے جو کسی مسلک فقہ یا کسی امام کی پیروی نہ کرے۔ بلکہ معاملہ پیش آنے کے بعد براہ راست شرعی دلائل کی روشنی میں از خود مسائل و احکام کا استنباط کرے۔ ان دونوں اصطلاحوں میں مقید اور مطلق کا تعین مسالک فقہ کی نسبت سے ہے۔ یعنی مروجہ مسالک فقہ کا پابند رہ کر مسئلہ بیان کرنے والا مجتہد مقید ہے، اور مروجہ مسالک فقہ کی پابندی کے بغیر مسئلہ بیان کرنے والا مجتہد مطلق۔

اس کے بعد مزید تدقیق کر کے مجتہد مقید کی کئی قسمیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً مجتہد منتسب مجتہد تخریج، مجتہد ترجیح، مجتہد الفتیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں مجتہد کی یہ قسمیں بتائی ہیں۔ لیکن اگر تدقیق کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس فہرست میں مزید اتنے ہی مجتہدین کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جتنا کہ بیان کیا جاتا ہے۔

اس معاملہ کو اگر فطری انداز سے دیکھا جائے تو بنیادی طور پر مجتہدین کی صرف دو قسمیں قرار پائیں گی۔ میں ان کو کلی مجتہد اور جزئی مجتہد کہوں گا۔ جزئی مجتہد وہ ہے جو شریعت کے فروعی احکام میں مسلّمہ فقہی اصولوں کے مطابق اجتہاد کرے۔ کلی مجتہد وہ ہے جو کسی پیش آمدہ صورت معاملہ میں رواجی ڈھانچہ سے اوپر اٹھ کر شریعت کے وسیع تر اور گہرے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیقی نوعیت کا ایک اصول وضع کر سکے۔

رسول اور اصحاب رسول کی زندگی میں جس طرح تمام معاملات و مسائل کے لئے نظیریں موجود ہیں۔ اسی طرح جزئی اجتہاد اور کلی اجتہاد کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ ان نظیروں اور مثالوں کا مطالعہ کر کے بعد کے زمانوں کے لئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

جزئی اجتہاد کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق سے فراغت کے بعد ذوالقعدہ ۵ھ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی بستی بنو قریظہ کے محاصرہ کے لئے ان کی طرف صحابہ کی ایک جماعت بھیجی۔ ان کو روانہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک وہ بنو قریظہ کی بستی میں نہ پہنچ جائے (لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظۃ) السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۳/ ۲۲۵

مہم روانہ ہوئی تو راستہ میں عصر کا وقت آگیا۔ کچھ لوگوں نے حکم کی لفظی تعمیل کی۔ وہ راستہ طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب بنو قریظہ کی بستی میں پہنچ گئے، اس وقت سواری سے اتر کر عصر کی نماز پڑھی۔ کچھ اور افراد کو اندیشہ ہوا کہ عصر کا وقت شاید نکل جائے۔ چنانچہ انھوں نے درمیان میں رک کر عصر کی نماز ادا کی۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے مراد تعجیل سیر تھی نہ کہ ہر حال میں نماز کی ادائگی میں تاخیر۔

بنو قریظہ کے سفر کا یہ واقعہ جزئی اجتہاد کی ایک مثال ہے۔ یہ مثال خود اصحاب رسول کے ذریعہ قائم ہوئی۔ اس میں بظاہر حکم رسول کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اجتہاد میں ابتدائی حکم سے ظاہری مطابقت ضروری نہیں ہے۔ اگر اجتہاد میں حکم شرعی کی اصل روح پائی جا رہی ہو تو وہ صحیح اجتہاد قرار دیا جائے گا۔

دور اول میں اجتہاد کلی کی ایک مثال وہ ہے جو حدیبیہ کے موقع پر پیش آئی۔ حدیبیہ کا معاہدہ تمام ظاہری حالات سے اوپر اٹھ کر کیا گیا۔ اس اعتبار سے وہ کلی اجتہاد کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ایک معیاری نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حدیبیہ کا معاہدہ دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا جو یکطرفہ شرائط کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتر چکی تھی کہ ان لوگوں کو لڑائی کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جا رہی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا (الحج ۳۹) حدیبیہ کے وقت اور حدیبیہ سے پہلے فریق ثانی واضح طور پر ظلم اور جارحیت کا معاملہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑی گئی۔

عمرہ کی ادائگی کے بغیر حدیبیہ سے واپسی سراسر ملی وقار کے خلاف تھی مگر آپ نے اس کو نظر انداز

کر دیا۔ معاہدہ کے کاغذ سے رسول اللہ کا لفظ مٹانا گویا اپنی اصل حیثیت کو مجروح کرنا تھا مگر اس کے باوجود آپ نے رسول اللہ کا لفظ کاغذ سے مٹا دیا۔ ابوجندل کو زخمی حالت میں دشمنوں کی طرف واپس بھیجنا سخت جذباتی معاملہ تھا مگر اس کو بھی آپ نے برداشت کر لیا۔ حدیبیہ میں صحابہ کے پڑاؤ پر مکہ کے آدمیوں نے خشت باری کی مگر آپ نے اس کا انتقام نہیں لیا۔ اس طرح کے متعدد اشتعال انگیز واقعات پیش آئے۔ مگر آپ نے ان سب سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ نے کلی مصلحت کو جزئی مصالح کے اوپر غالب رکھا۔

حدیبیہ کے وقت جو حالات تھے وہ سب کے سب ٹکراؤ کی طرف لے جانے والے تھے۔ اور ظاہری احکام شریعت کے مطابق، اس وقت یہ ٹکراؤ عین جائز بھی تھا۔ مگر آپ نے اس قسم کے تمام حالات سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ نے قریبی مصلحتوں کو نظر انداز کرکے دور کی پائدار مصلحتوں کو اہمیت دیتے ہوئے صلح کے معاہدہ پر دستخط کر دئے۔ اس کا نتیجہ، قرآن اور تاریخ کی شہادت کے مطابق، فتح مبین کی صورت میں برآمد ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ نے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں کلی اجتہاد کی ایک نہایت ممتاز مثال قائم کی ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس لئے ہوا کہ وہ اہل ایمان کے لئے ایک نمونہ ہو جائے اور ان کو ایک سیدھا راستہ دکھا دے (الفتح ۲۰) گویا حدیبیہ کا معاملہ قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے اجتہاد کلی کا ایک معیاری نمونہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کو اجتہاد کلی کی ضرورت ہے۔ یہ اجتہاد کلی ان کے لئے گویا ایک برتر حل (superior solution) ثابت ہوگا۔ وہ اسی طرح ان کے مستقبل کے لئے فیصلہ کن بن جائے گا جس طرح دور اول میں حدیبیہ کا معاملہ اسلام کی تاریخ کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔

پچھلی صدیوں میں برصغیر ہند میں، نیز پوری مسلم دنیا میں، مسلم رہنماؤں نے بار بار بڑے بڑے اقدامات کئے ہیں۔ ان اقدامات میں غیر معمولی جانی و مالی قربانیاں دی گئی ہیں۔ مگر یہ تمام اقدامات مکمل طور پر بے نتیجہ رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ تمام اقدامات جزئی اجتہاد کی بنیاد پر کئے گئے۔ جب کہ حالات کا تقاضا تھا کہ کلی اجتہاد والی بصیرت کے تحت فیصلہ کیا جائے۔

جزئی اجتہاد یا جزئی استنباط کی بنیاد کسی ایک حکم شرعی پر قائم ہوتی ہے۔ جب کہ کلی اجتہاد یا کلی استنباط مجموعی شرعی مصلحت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت سلمان فارسی جب مکہ سے ہجرت کر رہے تھے تو ان کے پاس کچھ دینار موجود تھے۔ قریش کے کچھ نوجوانوں نے ان کا راستہ روکا اور کہا کہ ہم ان دیناروں کو لے کر تمہیں مدینہ جانے نہیں دیں گے۔ اس وقت اگر حضرت سلمان فارسی اس حدیث کو یاد کرتے کہ مَنْ قُتِلَ دونَ مالہ فھو شھید اور اپنے مال کو بچانے کے لئے قریش کے نوجوانوں سے لڑ جاتے تو یہ جزئی استنباط ہوتا۔ مگر انھوں نے وسیع تر اسلامی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے تمام دینار قریش کے نوجوانوں کے حوالے کر دئے۔ انھوں نے مال کو بچانے کی فکر نہیں کی، بلکہ اپنی جان کو بچا کر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ ان کی یہ روش کلی استنباط کی ایک مثال تھی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم دنیا میں جو بڑے بڑے اقدامات کئے گئے، وہ سب کسی نہ کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دے کر کئے گئے۔ مگر یہ سب جزئی استنباطات تھے، جب کہ اس زمانہ میں مجموعی اسلامی مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے کلی استنباط کی ضرورت تھی۔ اس کوتاہی کی بنا پر ان کا استنباط یا اجتہاد اجتہادی خطا کی مثال بن گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مختلف طاقتوں سے ٹکراؤ کیا تو اس کے سامنے اسلام کا صرف یہ حکم تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کو زیر کرو۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کی اسکیم بنائی۔ سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ علماء دیوبند نے انگریزوں سے جہاد بالسیف کیا۔ اس طرح کے تمام واقعات اسلام کے حکم —— دشمنوں کا مقابلہ کرو —— سے مستنبط کئے گئے تھے۔

اسی طرح اقبال کا علیحدہ مسلم اسٹیٹ کا نظریہ اور تقسیم کے بعد اٹھنے والی مسلم پرسنل لا تحریک، بابری مسجد تحریک اس قسم کی تمام تحریکیں تحفظ شریعت کے حکم سے اخذ کی گئی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے اس کلی اجتہاد کی ضرورت تھی جو مجموعی مصالح شرعی کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مگر تمام مصلحین صرف جزئی استنباط کی حد تک پہنچ سکے۔ وہ شریعت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر کلی استنباط یا کلی اجتہاد کا ثبوت نہ دے سکے، اس لئے نہ

ان کا استنباط مطابق حال تھا اور نہ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا۔

بعض حالات میں جزئی اجتہاد بھی کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ بنو قریظہ کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ ایسے کلی اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مصالح کلی کی رعایت پائی جاتی ہو۔ موجودہ زمانہ میں اسی قسم کے کلی اجتہاد کی ضرورت تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اسلام اس قسم کے کلی اجتہاد تک نہ پہنچ سکے، اس لئے وہ ملت کے لئے ایسا اقدام بھی تجویز نہ کر سکے جس میں مصالح کلی کی رعایت پائی جاتی ہو۔

کلی استنباط کے لئے وہ مجتہدانہ بصیرت درکار ہوتی ہے جس کی توجہ جزئیات دین سے زیادہ اساسات دین پر ہو۔ جو احکام شریعت کے ساتھ تاریخ کی طاقتوں کو بھی جانتا ہو۔ جو الفاظ شریعت کے ساتھ اسرار شریعت کی گہرائیوں تک بھی پہنچ چکا ہو۔ جس کے ایمان نے اس کو وہ فراست ربانی عطا کی ہو جب کہ آدمی خدا کی روشنی سے دیکھنے لگتا ہے جو علوم الٰہی کا عارف ہونے کے ساتھ بصیراً بزمانہ کے درجہ پر بھی فائز ہو۔

یہ وہ عالم شریعت ہے جس کی نگاہ وقتی مسائل سے گزر کر دور تر مسائل تک پہنچ گئی ہو۔ جو قریبی حالات سے زیادہ مستقبل کے حالات پر نظر رکھے۔ جو کسی اقدام کے مابعد نتائج کو بھی سمجھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جو مسائل و مشکلات کے درمیان مواقع اور امکانات کو دریافت کر سکے۔ جو خواہشات انسانی کے دائرہ سے نکل کر فیصلۂ خداوندی کے اشاروں کو پڑھنے والا بن گیا ہو۔ جو اس راز کو جانے کہ کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی نہ بولنا۔ کبھی کرنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی نہ کرنا۔ جو ظاہری ہنگاموں کے درمیان چھپے ہوئے عوامل کو جانے، جو پسپائی کے واقعہ کو بھی اقدام کے روپ میں دیکھ سکے۔

دعوہ ایمپائر

اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) نے برصغیر ہند میں اسلام کا پولیٹکل ایمپائر بنانا چاہا۔ مگر طویل ترین زمانہ تک ہر قسم کی کوشش اور قربانی کے باوجود وہ یہاں مطلوب پولیٹکل ایمپائر بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد سے آج تک تقریباً تین سو سال سے تمام رہنماؤں کا یہی سب سے زیادہ پسندیدہ خواب رہا ہے۔ کوئی اس مقصد کے لئے جہاد بالسیف

تک گیا۔ اور کسی کے حالات نے اس کو جہاد بالقلم اور جہاد باللسان تک محدود رکھا۔ تاہم یہ تین سو سالہ کوششیں بے حساب جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود سراسر بے نتیجہ رہیں۔

اس کا سبب یہی تھا کہ ان تمام رہنماؤں کا ذہن جزئی دائرہ میں کام کرتا رہا۔ وہ جزئیات سے اٹھ کر کلیات کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔

اس اجتہادی خطا کا اصل راز یہ ہے کہ مغربی قوموں کی طرف سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو چیلنج پیش آیا، اس میں عسر کے ساتھ یسر کا پہلو وافر مقدار میں موجود تھا۔ مگر ہمارے تمام رہنما عسر کے پہلو میں اتنا الجھے کہ وہ یسر کے پہلوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

مغربی تہذیب کے ظہور کا ایک ابتدائی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ان قوموں کو سیاسی غلبہ عطا کر دیا۔ مگر اس تہذیب نے انسانی معاملات میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ عظیم امکان کھول دیا تھا کہ پولٹیکل ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی ایک چیز قائم کی جا سکے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو ہم نے دعوہ ایمپائر کہا ہے۔

پولٹیکل ایمپائر میں طاقت کا انحصار تمام تر سیاسی قوت پر ہوتا ہے۔ جب کہ دعوہ ایمپائر میں طاقت کا انحصار تمام تر فکری اور نظریاتی قوت پر ہوتا ہے۔ سیاسی یا فوجی قوت کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں۔ اس معاملہ میں تلک الایام نداولہا بین الناس کی سنت الٰہی کار فرما ہوتی ہے اور وہ کسی بھی قوم کے حصہ میں آ سکتی ہے۔ مگر فکری اور نظریاتی قوت کے معاملہ میں اہل اسلام کو تنہا اجارہ داری حاصل ہے۔ کیوں کہ اسلام واحد مذہب ہے جو تاریخی طور پر معتبر مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب تبدیلیوں کے نتیجہ میں تاریخی اعتباریت کھو چکے ہیں۔ اس طرح دعوہ ایمپائر بنانے کی صلاحیت حقیقی معنوں میں اسلام کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

قدیم زمانہ کے حالات میں صرف پولٹیکل ایمپائر ہی اصل اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے عالمی سطح پر اپنا ایک پولٹیکل ایمپائر بنایا۔ مگر موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اب دوسری غیر سیاسی چیزوں نے اولین اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصلحین اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان پر اپنا سر

ٹکراتے رہے۔ جب کہ ہمیں اسی وقت ان کے لئے دوسرے مواقع کو استعمال کرکے دوبارہ زیادہ طاقت ور انداز میں دعوہ ایمپائر بنانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

قدیم زمانہ میں اقتصادیات کا انحصار تمام تر زمین پر ہوتا اور زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی۔ اس لئے بادشاہ کے سوا کوئی اور شخص اقتصادی قوت کا مالک نہیں بن سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں انڈسٹری کی ترقی نے زمین کو ثانوی حیثیت دیدی ہے اور صنعت وتجارت کو اقتصادی معاملہ میں اولین اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، انڈسٹری پوری طرح ایک آزاد شعبہ ہے۔ کوئی بھی شخص یا کوئی بھی گروہ انڈسٹری کے مواقع کو استعمال کرکے اعلیٰ ترین اقتصادی ذرائع کا مالک بن سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں الناس علی دین ملوکہم کا اصول تھا۔ کیوں کہ بادشاہ کے سوا کسی کے پاس یہ طاقت نہ تھی کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر سکے۔ موجودہ زمانہ میں کمیونی کیشن کے جدید ذرائع نے اس صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جدید ذرائع مواصلات کو استعمال کرکے شاہی محل کے لوگوں کو بھی اپنا مخاطب بنا سکے۔ وہ دنیا بھر کے تمام کچے اور پکے مکانات میں بلا روک ٹوک داخل ہو جائے۔

قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ سرکاری مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی آزادانہ تبلیغ کی اجازت نہ تھی۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اہل حق اپنے پیغام کو لے کر اٹھیں اور کسی بھی پابندی کے بغیر اس کو ایک ایک شخص تک پہنچا دیں۔ اور مذہبی معاملات پر آزادانہ بحث ومباحثہ کے ذریعہ دین حق کی صداقت کو ثابت اور مبرہن کر سکیں۔

اس طرح کی بہت سی دوررس تبدیلیاں موجودہ زمانہ میں ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ اہل اسلام ہر ملک میں اعلیٰ درجے کے مدرسے اور اسلامی مرکز بنائیں۔ وہ مسجدوں اور دینی اداروں کا نظام ہر جگہ قائم کریں۔ وہ دعوتی سرگرمیوں کو مؤثر ترین انداز میں جاری کر سکیں۔ وہ ہر قسم کے معاون اداروں کے ذریعہ اسلام کو ایک طاقت ور تحریک کی حیثیت دے دیں۔ وہ جدید ترین وسائل کو استعمال کرکے ہر ملک میں اپنا دعوہ ایمپائر کھڑا کر سکیں۔

اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا۔ اسلام کا حاصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔ اسلام کا نشانہ نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ محض سیاسی غلبہ۔ اسلام کا اصل مقصود جنت ہے، اسلام کا اصل مقصود حکومت نہیں۔

قدیم زمانہ میں سیاست کا ادارہ ہی واحد طاقت ور ادارہ تھا۔ اس لئے اسلام کے غیر سیاسی مقصود کو حاصل کرنے کے لئے بھی سیاست سے تعرض پیش آیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ صورتحال یکسر بدل گئی ہے۔ اب اگر کسی مقام پر اہلِ اسلام کو حکومتی ادارہ میں غلبہ حاصل نہیں ہے تو اس پر انھیں کچھ بھی ملال کرنے کی ضرورت نہیں۔ جدید ذرائع کو استعمال کرکے وہ حکومت کے باہر بھی وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں جن کی توقع پہلے صرف حکومتی ادارہ سے کی جاتی تھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کا یہ حال ہوا کہ وہ قدیم امکانات کو جانتے تھے، مگر جدید امکانات سے عملاً وہ بے خبر رہے۔ اسی لئے اس راز کو سمجھنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوا کہ حکومت سے باہر وہ حکومت سے بھی زیادہ طاقت ور ادارہ بنا سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ افکار کی اشاعت عالمی سطح پر بے روک ٹوک اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جاری کی جا سکے۔ ایسی اسلامی یونیورسٹی بنائی جائے جو تمام دنیا کے لئے علوم الٰہی کا سرچشمہ بن جائے۔ ایسا ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن قائم کیا جائے جہاں سے بیک وقت تمام اہل عالم کو خطاب کیا جا سکتا ہو۔ ایسا اقتصادی ہاؤس بنایا جائے کہ حکومتوں کے تعاون سے بے پروا ہو کر تمام اسلامی سرگرمیوں کو خود اپنی بنیاد پر جاری کیا جا سکے۔

اسی کے ساتھ موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ اسلامی اخلاقیات کا عمومی مظاہرہ کیا جا سکے۔ جدید طرز کے اسپتال، جدید طرز کے رفاہی ادارے، معذور افراد کے لئے جدید معیار کی سہولتیں، اور اس قسم کے دوسرے بہت سے کام حکومت کے اشتراک وتعاون کے بغیر اعلیٰ ترین سطح پر کئے جا سکتے تھے، جیسا کہ بعض قومیں انجام دے رہی ہیں۔

اسی قسم کے مختلف کاموں کے مجموعہ کو ہم نے دعوہ ایمپائر کہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مصلحین اگر کلی اجتہاد کی صلاحیت کے حامل ہوتے تو وہ ان امکانات ومواقع کو دیکھتے۔ اس کے بعد

وہ ایسا نہ کرتے کہ سیاست کی قربان گاہ پر قوم کو لے جاکر اس کی ہلاکت کا سامان کریں۔ بلکہ وہ لوگوں کو یہ سبق دیتے کہ جدید امکانات کو استعمال کر کے دعوہ ایمپائر بناؤ اور پھر اسلام کو سارے عالم کی فکری قیادت کے مقام پر پہنچادو۔

یہ دعوہ ایمپائر اصلاً غیر سیاسی دائرہ میں بنے گا۔ مگر جب وہ بن جائے گا تو وہ بالواسطہ طور پر سیاسی ادارہ کو بھی متاثر کرے گا، حتی کہ عین ممکن ہے کہ وہ وقت آئے جب کہ خود سیاسی ادارہ بھی اس دعوہ ایمپائر کا ایک ماتحت حصہ بن جائے۔

خلاصۂ کلام

جزئی اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ بروقت جو صورت حال (الوضع الراھن) سامنے ہے اس کے سلسلہ میں حکم شرعی کو معلوم کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ کلی اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ بروقت قائم شدہ صورت حال کے بارے میں وہ موقف اختیار کیا جائے جس میں شریعت کی اصل روح کے ساتھ عمومی مصلحت کی رعایت ہو، اور جو بالآخر موجودہ صورت حال کے وقتی حل سے آگے بڑھ کر اسلام کے وسیع تر مقصد تک پہنچانے والا ثابت ہو۔ گویا مصلحتِ وقتی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا رخ متعین کرنے کا نام جزئی اجتہاد ہے اور مصلحتِ عمومی کو ملحوظ رکھ کر عمل کا رخ متعین کرنے کا نام کلی اجتہاد۔

In emergency use hammer to break window.

ڈبہ کے دونوں طرف بہت بڑے شیشے لگے ہوئے تھے جس سے باہر کا منظر بالکل صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ پورے راستہ میں دونوں طرف دور تک پھیلا ہوا سبزہ تھا اور اس کے درمیان کہیں کہیں خوبصورت مکانات۔ میری سیٹ کے قریب ایک علیحدہ اور کسی قدر کشادہ سیٹ تھی۔ یہ معذوروں کی رعایت سے بنائی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا:

Please give up this seat if a disabled person needs it.

اسٹیشن پر اترے تو وہ بالکل جدید طرز کے ہوائی اڈہ کی مانند بنا ہوا تھا۔ اگر آپ کو کسی تعاون کی ضرورت ہو تو فوراً آپ کو ریلوے کے ذمہ دار اس کے لئے تیار ملیں گے۔

میں نے سوچا کہ ہمارا لکھنے والا طبقہ برطانیہ کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ حقیقی برطانیہ سے کتنا زیادہ مختلف ہے۔ یہ طبقہ یہ کرتا ہے کہ اخباروں وغیرہ سے کچھ منفی پہلو لیتا ہے اور اس میں مبالغہ کے ذریعہ کچھ اور اضافہ کرکے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے برطانیہ کی نہایت مکروہ تصویر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ فارسی شاعر نے کہا تھا کہ "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ یا تو صرف عیب بیان کرنا جانتے ہیں یا صرف ہنر۔ منصفانہ کلام کی جیسے ان کے اندر صلاحیت ہی نہیں۔

برمنگھم ریلوے اسٹیشن پر جناب شمشاد حسین خاں صاحب موجود تھے۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے آدمی ہیں اور اپنے بزنس کے ساتھ یہاں دعوت کے کام میں مشغول ہیں۔ یہاں میرا قیام انھیں کی رہائش گاہ پر تھا۔ انھوں نے بتایا کہ چوں کہ مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے گھر سے چلتے ہوئے گاڑی میں مصلا رکھ لیا اور ریلوے اسٹیشن پر نماز پڑھی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹیشن پر نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج ہم کو پوری آزادی حاصل ہے۔ ہم جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں جب کہ قدیم مکہ میں یہی کام عیاناً نہیں کیا جاسکتا تھا۔ راستہ میں انھوں نے ایک گفتگو کے دوران ایک جملہ کہا جو مجھے بہت پسند آیا۔ انھوں نے کہا: بندے کی عظمت بندگی میں ہے۔

۲۴ ستمبر کو مغرب بعد کا وقت تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر میں جناب شمشاد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری گاڑی برمنگھم کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف پررونق دکانیں

اور دفاتر رنگ برنگ روشنیوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ مگر اس ظاہری جگمگاہٹ کے پیچھے یہاں کی جو حقیقی اقتصادی حالت ہے وہ اطمینان بخش نہیں۔ صنعتی دور انسان کے لئے بہت سی خوبیاں لے آیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایسے مسائل بھی پیدا کر دئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ لندن کے بعد برمنگھم یہاں کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

یہاں میں نے ایک صاحب سے کہا کہ برطانیہ اس وقت ریسشن کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتنا ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں ریسشن (recession) آیا۔ پھر سلم (Slump) آیا۔ اور اب ہم ڈپریشن (depression) کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ان تین دوروں کو سادہ طور پر اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ —— زیادہ خریداری، پھر کم خریداری، اور پھر بے خریداری۔

برمنگھم میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ وہ یہاں کی آبادی میں تقریباً ۱۰ فیصد ہیں۔ یہاں کی چھوٹی بڑی مسجدوں کی تعداد ۹۰ تک پہنچتی ہے۔ ایک بار برمنگھم میں سفر کرتے ہوئے ہم ایک ایسے علاقہ سے گزرے جو مسلم علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک دکان کے سامنے ایک اشتہار لگا ہوا تھا —— "جہاد کشمیر کانفرنس"۔ میں نے سوچا کہ جہاد کانفرنس کی ہر طرف دھوم ہے مگر کوئی نہیں جو حل کانفرنس کرنے کا اہتمام کرے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا امن کانفرنس کر رہی ہے اور مسلمان جنگ کانفرنس۔

میں جہاں ٹھہرا ہوں وہ نہایت پرفضا علاقہ ہے۔ کھلے کھلے مکانات قرینہ کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف خوبصورت لان اور وسیع پارک کے مناظر ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ اس علاقہ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک گاؤں ہے، اور اس کا نام ارلس وڈ (Earls wood) ہے۔ انڈیا میں گاؤں پچھڑی ہوئی بستی کا نام ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں سے مراد وہ خوبصورت بستیاں ہیں جو شہروں کے باہر ہیں۔ جہاں شہری ہنگاموں کے سوا تمام جدید ترین سہولت پوری طرح موجود ہو۔

برطانیہ کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ یہاں میں نے عشا کی نماز پڑھی تو خیال آیا کہ عین اسی وقت اگر میں انڈیا پہنچ جاؤں تو وہاں کی مسجدوں میں عصر کی نماز کی تیاری ہو رہی ہوگی۔ یعنی جس وقت یہاں رات ہے عین اسی وقت وہاں دن ہے۔ اس فرق پر

میں نے غور کیا تو ذہن میں آیا کہ شاید یہی وہ چیز ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ : رَبّ المشارق والمغارب (المعارج ۴۰)

قدیم زمانہ کا انسان صرف مقامی دائرہ میں سوچتا تھا۔ اس کو اس بات کی کوئی خبر نہ تھی کہ جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر دوسری آفتابی حالت ہوگی۔ یا جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر اس کے علاوہ دوسرا آفتابی منظر ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے جب کہ انسان تعدد مشارق اور تعدد مغارب کی حقیقت سے بے خبر تھا، یہ صرف کسی برتر ہستی ہی کے لئے ممکن تھا کہ وہ اس کائناتی حقیقت کو جانے اور اس کے بارہ میں نہایت صحیح بیان دے سکے۔

جناب شمشاد صاحب نے بتایا کہ برمنگھم سے کچھ فاصلہ پر نوریٹن (Nureaton) میں تقریباً ۱۵ سال پہلے گجراتیوں نے ایک مسجد بنائی۔ سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کی اجازت لینا تھا۔ مقامی انگریزوں نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں مسجد تعمیر ہوئی تو یہ لوگ شور وغل کریں گے۔ گندگی پھیلائیں گے اس کے بعد ہمیں اپنے گھروں کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ تاہم ان کے اختلاف کے باوجود شہری کونسل (کارپوریشن) نے اس کی اجازت دے دی۔ اب یہاں کے مسلمان چندہ جمع کرنے کے لئے نکلے۔ لندن میں ان کی ملاقات ایک سعودی شیخ سے ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ مسجد کی تعمیر کے لئے کتنے خرچ کا اندازہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ملین پونڈ۔ شیخ نے تنہا اپنی جیب سے ایک ملین پونڈ دے دیا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی۔ انگریزوں کے اندیشے کے برعکس مسجد اس علاقہ میں خوبصورت تعمیر اور سکون اور صفائی کے ماحول کی مثال بن گئی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ انگریز اپنے کہنے کے مطابق، مسجد کی تعمیر کے بعد اس علاقہ سے جانا شروع کر دیں گے اور ہم ان کے مکانوں کو خرید کر یہاں مسجد کے پاس آباد ہو جائیں گے۔ مگر کئی سال گزر گئے اور کوئی انگریز وہاں سے نہیں گیا۔ اس کے بعد ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس مسجد کے بننے کے بعد تو ہم اپنے آپ کو زیادہ سیکیور محسوس کرنے لگے ہیں۔ مسجد کے لوگ نہایت ڈسپلن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں اچھے لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے اور برگلری کا خطرہ ختم ہو گیا ہے جس کا اندیشہ ہم کو پہلے لگا رہتا تھا۔ پھر

ہم کیوں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور جائیں۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ آج ہمارے مسلم دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ کہانی کے حصۂ اول کو لے کر کہنے لگتے ہیں کہ مغربی لوگ اسلام دشمن ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ عین اسی وقت کہانی کا نصف ثانی ان کے لئے زبردست مثبت سبق کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

آئی پی سی میں جناب عبدالمجید صوفی (بریڈ فورڈ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ قدیم کتابیں جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی:

Thomas Carlyle, lectures on Heroes,
Chapman and Hall, London 1888

اس کتاب کا ایک لکچر ہیرو پیغمبر (The Hero As Prophet) ہے۔ یہ لکچر لندن میں ۸ مئی ۱۸۴۰ کو دیا گیا تھا۔ اس میں پیغمبر اسلام کو تمام پیغمبروں کا "ہیرو" بتایا گیا ہے۔

عبدالمجید صوفی کے پاس اس کتاب کا ۱۸۸۸ کا نسخہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ساری دنیا ان کے قدموں میں تھی، جب یہ لوگ انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے۔ اس وقت کارلائل نے رسول اللہؐ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا۔

میں نے کہا کہ "۱۸۴۰ میں اتنا بڑا واقعہ لندن میں ہوا۔ مگر اس وقت کے مسلم لیڈروں میں سے کوئی نہیں جو اس کو جانے اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کرے۔ ہمارے رہنما انگریز کے نام سے صرف "ڈائر" سے واقف تھے، وہ انگریز کے نام سے "کارلائل" سے واقف نہ ہو سکے۔

برمنگھم کے الہجرہ اسکول کے ہال میں ۲۴ ستمبر کو ایک تقریر تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ حضرات جمع ہوئے۔ تقریر کا موضوع تھا: اسلام اور عصر حاضر۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر مجلسیں ہوئیں ان میں الرسالہ مشن اور دوسرے ملی موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس طرح ۲۴ ستمبر کا تقریباً پورا دن لوگوں سے بات چیت میں گزر گیا۔

ایک اجتماع میں قاری صاحب نے قرآن کی وہ آیتیں تلاوت کیں جن میں لا ترفعوا اصواتکم

فوق صوت النبی (الحجرات ۲) ہے۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ قاری صاحب نے جو آیت پڑھی، اس میں موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے مسلم مسئلہ کا جواب ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت ہر جگہ یہ ہو رہی ہے جیسے ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں، حالاں کہ قرآن ابدی کتاب کی حیثیت سے محفوظ طور پر ان کے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کے ازسرنو انطباق (reapplication) کی ضرورت تھی۔ مگر مسلمان جدید حالات پر قرآن کے انطباق میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی کا مطلب اسباب نزول کی روایات کے مطابق، یہ ہے کہ مدینہ میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور زور سے بولتے تھے۔ وہ رسول کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرتے تھے، قرآن میں اس سے منع کیا گیا اور اس پر حبط اعمال کا اندیشہ بتایا گیا۔ اب اس کا ازسرنو انطباق یہ ہے کہ اس کو موجودہ زمانہ میں لوگوں کے اس مزاج پر منطبق کیا جائے کہ ان کے سامنے قرآن وحدیث پیش کیا جائے تو وہ اس کے جواب میں اپنی ذاتی ریزننگ پیش کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہے اور دوبارہ اس میں حبط اعمال کا اندیشہ ہے۔

اگر ہم ایسا کر سکیں کہ قرآن کی تعلیمات کو ازسرنو جدید حالات پر منطبق کریں تو فوراً ہی قرآن ہمارے لئے ایک رہنما کتاب بن جائے گا۔ اس میں ہم اپنے آج کے لئے رہنمائی پانے لگیں گے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے بس ایک مقدس کتاب بن کر رہ گیا ہے، اور ظاہری احترام کے سوا اس کا کوئی اور حق ہم کو معلوم نہیں۔

۲۵ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے برمنگھم کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں لوگوں کی فرمائش پر نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ تقریر کا موضوع "اسلامی عبادت" تھا۔ میں نے کہا کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ المساجد بیوت المتقین۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجدیں تقوی کی تربیت کا مرکز ہیں۔ اس سلسلہ میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ نماز کس طرح آدمی کو متقیانہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔

نماز سے پہلے ماہنامہ صراط مستقیم کے مدیر محترم نے ایک انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر پاکستان

اور عالم اسلام کے مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کو تفصیل کے ساتھ بتایا گیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ہر ایک سے اختلاف ہے اور آپ دوسری جماعتوں سے کٹ کر اپنا ایک نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ میں نے کہا کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اساسیات میں اختلاف، اور دوسرا فروع میں اختلاف۔ میرا اساسیات میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً تمام لوگ رسول اللہ کو خاتم الرسل مانتے ہیں تو میں بھی رسول اللہ کو خاتم الرسل مانتا ہوں۔ میرا جو کچھ اختلاف ہے وہ فروعات میں ہے اور فروعات میں اختلاف صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء کے درمیان ہمیشہ رہا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ اختلاف کا نہیں بلکہ غیر ضروری حساسیت کا ہے۔ لوگ غیر ضروری طور پر اختلاف کے معاملہ میں حساس ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر وہ فروع میں اختلاف کو وہ درجہ دینے لگے ہیں جو اساسیات میں اختلاف کا درجہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہی غیر ضروری حساسیت ہے جس نے مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ نفس اختلاف نے۔

نماز کے بعد تعلیم یافتہ حضرات کا ایک حلقہ جمع ہو گیا اور دیر تک ان سے ملی اور اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس میں کچھ کشمیری حضرات تھے۔ ایک کشمیری صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ (اگست ۱۹۹۲) میں کشمیر کے تعلق سے ایک پیغام شائع ہوا تھا۔ اس کا کیا ریسپانس آپ کو ملا۔ میں نے کہا کہ اس کی اشاعت کے بعد کشمیر کے جنگجو نوجوان گن لے لے کر الرسالہ کے تمام ڈسٹری بیوٹرس کے یہاں پہنچے اور کہا کہ یا تو الرسالہ کا ڈسٹری بیوشن بند کر دو یا ہماری گولی کھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

مجھ کو جب اس کی اطلاع ملی تو مجھے غم کے بجائے تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ جو تحریک اتنی کمزور ہو کہ الرسالہ جیسا ایک ماہنامہ اس کے لئے خطرہ بن جائے وہ میرے نزدیک تحریک ہی نہیں۔ وہ بچوں کا کھیل ہے نہ کہ کوئی حقیقی تحریک۔ جنگجو حضرات کا یہ جنگجویانہ اقدام خود اپنے خلاف تھا نہ کہ ہمارے خلاف۔ یہ گفتگو ۴ ستمبر کو نماز جمعہ کے بعد برمنگھم کی جامع مسجد میں ہوئی۔

برمنگھم میں ایک نہایت خوبصورت مرکز ہے جس کا نام اسلامک پروپیگیشن سنٹر (IPC) ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ مرکز کی عمارت بذات خود نظم اور باقاعدگی اور منصوبہ بندی

کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ یہ مرکز اسلامی دعوت کا کام منظم انداز میں کر رہا ہے۔ وہ گھر گھر (door to door) اسکیم کے تحت اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہنچانا چاہتا ہے۔

۲۶ ستمبر کی دوپہر کو برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر دوبارہ ٹرین کے ذریعہ طے ہوا۔ دو گھنٹہ کے بعد ٹرین ٹھیک وقت پر لندن ایوسٹن کے پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی۔ ٹرین کے تمام دروازے اپنے آپ کھل گئے اور مسافر ایک کے بعد ایک باہر جانے لگے۔

آپ اس ٹرین (انٹر سٹی) کے ذریعہ لندن اسٹیشن پر پہنچیں اور آپ کو دوسرے مقام پر جانا ہے تو اسٹیشن سے ملحق انڈر گراؤنڈ ٹرین (ٹیوب) موجود ہوگی۔ آپ ایک بورڈ کے اندر پونڈ ڈالئے اور اپنے مقام کے نمبر کا بٹن دبا دیجئے۔ اس کے بعد آپ کا مطلوبہ ٹکٹ بھی نکل آئے گا اور فاضل رقم بھی۔ آپ آگے بڑھیں گے اور متحرک سیڑھیاں آپ کو نیچے پہنچا دیں گی۔ وہاں لکھا ہوا ہوگا کہ آپ کی مطلوبہ ٹرین ۲ منٹ میں آرہی ہے۔ اگر ایک ٹرین چھوٹ جائے تو دو منٹ کے بعد دوسری ٹرین آپ کے سامنے کھڑی ہوگی۔

انڈر گراؤنڈ ٹرین پورے شہر کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے برٹش ٹرین بنائی گئی ہے۔ وہ بھی اگر آپ کے لئے کافی نہ ہو تو اس سے اتر کر آپ فوراً اپنے مقام کے لئے بس پکڑ سکتے ہیں۔ اس پورے سفر کے دوران آپ کو بار بار ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ایک بار دن بھر کا ٹکٹ حاصل کر لیجیے۔ اس کے بعد اسی ٹکٹ سے سارے دن ٹیوب، برٹش ریل، بس تینوں سے سفر کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی مختلف چیزیں بتاتی ہیں کہ یہاں کا نظام پیشگی طور پر انسان کی ضرورتوں کا اندازہ کرتا ہے اور قبل اس کے کہ آپ اس سے کہیں، وہ آپ کی ہر ضرورت کا انتظام کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ حدیث میں ہے کہ جنت میں تم صرف خواہش کروگے اور تمہاری مطلوبہ چیز فوراً تمہارے سامنے آجائے گی۔ مذکورہ نظام گویا جنت کی اس صفت کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔

مسز اسرہ خان (لندن) کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہی ہیں اور اس کے مشن سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر باصرار دعوت دی کہ ان کے یہاں ایک پروگرام رکھا جائے۔ اس کے مطابق ۲۶ ستمبر کی شام کو ان کے یہاں پہنچا۔ اجتماع کا انتظام انھوں نے ڈاکٹر صبیحہ سالم کے مکان رچیز ل

ہرسٹ، پرکیا تھا۔ یہاں تعلیم یافتہ مرد اور عورت جمع تھے۔ اس موقع پر میری دو تقریریں ہوئیں۔ پہلی تقریر اقوال رسول کی روشنی میں۔ اور دوسری تقریر رسول اور اصحاب رسول کے واقعات کی روشنی میں۔ پہلی تقریر عشا کی نماز سے پہلے ہوئی اور دوسری تقریر عشا کی نماز کے بعد۔

مسز اسرہ خان نے الرسالہ کے بارہ میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر مضمون آدمی کے اندر اسلامی فیلنگ کو جگاتا ہے۔ جب ہم اس کا کوئی صفحہ پڑھتے ہیں تو عین اسی وقت ہمارا تعلق خدا اور رسول سے جڑ جاتا ہے۔ الرسالہ وقت کے اسلوب میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان کے شوہر اردو نہیں جانتے۔ وہ صرف انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو الرسالہ کی باتیں انگریزی زبان میں بتاتی ہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ کو جب میں لندن میں تھا۔ مسٹر فاروق جنگ کے یہاں ٹیلیفون آیا۔ آجکل وہ اپنی فیملی کے ساتھ بون میں مقیم ہیں۔ انھوں نے جرمنی آنے کی دعوت دی۔ مگر لندن سے بون جانا میرے لئے مشکل تھا۔ اس لئے میں ان کی دعوت کو قبول نہ کرسکا۔

انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ بروسیلز تک پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ ہم بروسیلز آکر آپ کو کار سے بون لے جاتے۔ کیوں کہ بروسیلز سے بون تک بذریعہ کار صرف دو گھنٹہ کا سفر ہے۔ اتفاق سے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ ورنہ میں پہلے سے اس کا پروگرام بناتا اور بروسیلز سے بون ضرور جاتا۔

بون (Bonn) جرمنی کی انتہائی قدیم بستی ہے۔ جس کی تاریخ پہلی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ تاہم ماضی میں اسے زیادہ ترقی نہ مل سکی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کی ترقی شروع ہوئی اب وہ جرمنی کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر سمجھا جاتا ہے۔

اس کی خوبصورتی کا زیادہ بڑا سبب یہ ہے کہ دریائے رینے (Rhine) کے کنارے واقع اس شہر کو ارباب دولت نے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا۔ دو سو سے زیادہ دولت مند (millionaires) یہاں آکر آباد ہو گئے۔ تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقہ جہاں آباد ہو وہ خوبصورت بستی ہو گی اور جاہل اور غریب طبقہ جہاں آباد ہو وہ بدہیئت بستی۔

بون سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ مثلاً مسیحیت کے دو مذہبی ادارے اینگلکن چرچ

اوراولڈ چرچ کے درمیان زبردست اختلافات تھے جو تقریباً سو سال تک شدت کے ساتھ جاری رہے۔ آخر کار دونوں کے درمیان گفت وشنید سے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کا اعلان بون میں کیا گیا۔ اس لئے اس کو بون اعلان (Declaration of Bonn) کہا جاتا ہے۔ یہ اعلان ۱۹۳۱ میں کیا گیا۔ اس کے تحت دونوں نے ایک دوسرے کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرلیا۔

جب اختلافات نظری اور اعتقادی سطح پر ختم نہ ہو رہے ہوں تو بہترین دانش مندی یہ ہے کہ نظری سطح پر اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے عملی سطح پر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جرمنی میں ٹرانزٹ پسنجر کی حیثیت سے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کچھ دن قیام کرکے جرمنی کو باقاعدہ طور پر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس دوران مطالعہ کے ذریعہ جو باتیں علم میں آئیں ان میں سے ایک قصہ یہ تھا۔

چند دن پہلے ۲۱ستمبر ۱۹۹۲ کو ایک واقعہ فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر ہوا۔ اس واقعہ کو میں نے اخبار میں پڑھا۔ ایک ہندستانی خاتون مسز مان سنگھ نے ایک جرمن مسٹر سونال (Mr Sonal) سے شادی کی ہے۔ وہ میونخ سے فرینکفرٹ پہنچیں۔ یہاں سے ان کو دہلی کی فلائٹ لینا تھا۔ ایئرپورٹ پر انتظار کے دوران وہ ایک بک شاپ (Julius Valtermahm) میں داخل ہوئیں۔ یہاں وہ ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ "سیلس وومن" جس کا نام ارسلا (Ursula) تھا، اس نے دیوار پر لگے ہوئے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لکھا تھا: پہلے خریدو، پھر پڑھو (Buy now, Read later)

بک شاپ میں کئی سفید فام عورتیں میگزین اٹھا اٹھا کر باقاعدہ طور پر پڑھ رہی تھیں۔ مسز مان سنگھ نے کہا کہ یہ عورتیں بھی تو پڑھ رہی ہیں۔ آپ ان کو کیوں نہیں منع کرتیں۔ اس پر دکان کی خاتون بگڑ گئیں۔ اس نے کہا کہ یہاں سے نکل جا، کالی عورت۔ یہ میری دکان ہے۔ میں جو چاہوں گی کروں گی:

Get out, you Black-head. This is my shop.
I will do what I like.

مسز مان سنگھ اس کے بعد ایئرپورٹ کے مختلف دفتروں میں گئیں تاکہ اپنی شکایت درج کرائیں۔ مگر

ایئرپورٹ کے کسی افسر نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ نہ ان کی شکایت درج کی گئی اور نہ اس کا دفعیہ کیا گیا۔ ہر ایک نے مسز مان سنگھ کو بیرونی راستہ دکھایا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ مسز مان سنگھ جرمن زبان جانتی تھیں اور اپنی شکایت کو بخوبی طور پر جرمن میں بتا سکتی تھیں۔

یہ رپورٹ خود مسز مان سنگھ نے چھاپی ہے۔ انھوں نے اس کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ آخر کار میں ایئرپورٹ سے نکل کر ہوائی جہاز میں داخل ہوئی۔ میں کھڑکی کی طرف اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی آنسوؤں کے ساتھ جرمنی کو الوداع کہا جس سے مجھے محبت تھی مگر اب مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ بدھا اور گاندھی کی سرزمین کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا:

I sat in my window seat, bade a teary goodby to the Germany I had loved but now feared and started my journey back towards the land of Buddha and Gandhi.

مسز مان سنگھ کا یہ تقابل درست نہیں۔ کیوں کہ جرمنی میں جو نسلی امتیاز رنگ کی بنا پر ہے وہی نسلی امتیاز انڈیا میں ذات کی بنا پر موجود ہے۔ اگر انڈیا میں بدھا اور گاندھی پیدا ہوئے تو اسی طرح جرمنی میں گوئٹے (Goethe) اور رلکے (Rilke) جیسے افراد پیدا ہوئے۔ دونوں جگہ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر موجود ہیں۔

مسز مان سنگھ کی غلطی یہ ہے کہ وہ جرمنی کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "ارسلا" کی مثال لے رہی ہیں اور انڈیا کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "گاندھی" کی مثال۔ یہ جنرلائزیشن درست نہیں۔ بیشتر غلط رائیں اسی قسم کے غلط جنرلائزیشن سے بنتی ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے پسندیدہ ملک سے ایک اچھی مثال لے کر اس کو عمومی بنا دیتے ہیں۔ اور جو ملک انھیں ناپسند ہو اس کی ایک بری مثال لے کر اس کو عموم کا درجہ دیدیتے ہیں۔ ایسے لوگ اس ملک کے بارہ میں بھی اندھیرے میں رہتے ہیں اور اُس ملک کے بارہ میں بھی۔

میں نے کچھ مسلمانوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں رہنا کیوں پسند کیا۔ ہر ایک کا جواب تھا کہ یہاں کے سسٹم کی خوبی انھیں یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض اخلاقی برائیوں سے قطع نظر، ان ملکوں کا سسٹم بڑی حد تک معیاری ہے۔

"نظامی" ذہن کے ایک مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ اسلام کو بہتر دنیوی نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں آج کے انسان کے لئے زیادہ کشش نہیں کیونکہ اس قسم کا نظام تو آج بھی اس کو حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا تعلق اصلاً دنیوی آسودگی سے نہیں ہے بلکہ اخلاقی تحفظ سے ہے۔ دنیوی آسودگی زیادہ تر انتم اعلم بامور دنیاکم سے تعلق رکھتی ہے۔

ٹرین میں ایک تعلیم یافتہ انگریز سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن کے مضافات میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کیرولین مورہیڈ (Caroline Moorehead) کی کتاب برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) تھی جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب برٹرینڈ رسل کا کا ایک تنقیدی مطالعہ ہے۔ مثلاً اس میں رسل کو غیر منطقی (illogical) بتایا گیا ہے۔

مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابتدائی تقریب کے بعد میں نے کہا کہ برٹرینڈ رسل کے بارہ میں مورہیڈ کی اس کتاب کو میں دیکھ چکا ہوں۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ برٹرینڈ رسل کے خیالات سے متاثر ہیں۔ خاص طور پر خدا کے وجود کے بارہ میں ان کے خیالات تقریباً وہی ہیں جو برٹرینڈ رسل کے خیالات تھے۔

انگریز اس طرح کسی اجنبی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن ایک مسافر کے لئے عام انگریز سے بات کرنے کا کوئی اور موقع پانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے میں اپنے ایشیائی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کی مداخلت کر لیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں نے برٹرینڈ رسل کو کافی پڑھا ہے۔ رسل نے لکھا ہے کہ میں خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔ اس کی دلیل رسل نے یہ دی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ مگر رسل کا یہ اعتراض سراسر غیر منطقی ہے۔

میں نے کہا کہ رسل بلاشبہہ ذہین تھا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس معاملہ میں اس کے لئے انتخاب باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات کے درمیان ہے۔ چوں کہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کے وجود کو مانیں، اس لئے ہم اس پر بھی مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو تسلیم کریں:

It is true that Bertrand Russell was a great mind. But he failed to realize that in this case, the option was not between the universe with God and the universe without God. Rather the real option was between the universe with God or no universe at all. As we are bound to acknowledge the existence of the universe, so are we bound to acknolwedge the existence of its Creator — God.

مذکورہ انگریز نے ابتداءً بالواسطہ انداز میں برٹرینڈ رسل کے الحادی نقطہ نظر کی حمایت کی تھی۔ مگر میری اس بات کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، میں اس پر غور کروں گا۔

لندن میں میرا قیام پروفیسر انیس تاری کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں ۲۶ ستمبر کو جناب جاوید حسن صاحب (Tel. 5581523) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک یہودی فرم میں کام کرتا ہوں۔ وہاں ایک کٹر قسم کا یہودی تھا۔ میں جب اس کے پاس سے گزرتا تو ہمیشہ اس کو گڈ مارننگ کہتا۔ مگر وہ مجھ کو جواب نہ دیتا، بلکہ منھ پھیر لیتا۔ آخر کار ایک روز اس نے کہہ دیا کہ تم کیوں مجھ کو گڈ مارننگ کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں:

Why you say good morning to me.
You know, I hate you.

اس کے جواب میں جاوید صاحب نے کہا کہ آپ کا شکریہ۔ مگر میں تو آپ سے نفرت نہیں کرتا (But I do not hate you) یہ جواب سن کر یہودی تعجب میں پڑ گیا۔ اس نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ سارے مسلمان یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور تم بھی نفرت کرتے ہوگے، کیوں کہ میں ایک یہودی ہوں۔ اس دن کی گفت گو کے بعد وہ کافی نرم پڑ گیا۔ یہاں تک کہ چند دن کے بعد وہ نارمل ہوگیا۔ اس کا حال یہ ہوگیا کہ جاوید صاحب کو دیکھتا تو دور ہی سے ہیلو، ہیلو کرنے لگتا۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنا کٹر یہودی ایک مسلمان سے اتنا قریب کیسے ہوگیا۔ اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ: یک طرفہ حسن اخلاق سے۔

لندن میں ایک اسلامیہ اسکولس ٹرسٹ (Tel. 01-6076655) ہے۔ اس کی طرف سے اسلامک ٹیچنگ کورس کا ایک سٹ خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہاں اس کی

پہلی جلد میں نے دیکھی۔ اس میں مذہب کی بحث کے تحت لکھا گیا ہے :

The whole notion of 'religion' as understood by Muslims is not restricted to rituals and religious observances, but it is an all encompassing concept which includes the social, economic and political: thus it is a way of life.

برمنگھم کے ایک مسلمان سے یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کی مسلم کمیونٹی اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ بدنام کمیونٹی ہے۔ عام طور پر یہاں اس کی اچھی ایمج نہیں۔ ان کو میں نے کتاب کا مذکورہ مضمون دکھایا۔ میں نے کہا کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب صرف کچھ عبادات اور مذہبی رسوم کا مذہب نہیں ہے بلکہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں۔ مگر زندگی کے معاملات میں مسلمان ہی سب سے زیادہ ناقص ہیں اور جن لوگوں کو آپ محدود مذہبی تصور کا الزام دیتے ہیں وہ زندگی کے معاملات میں آپ سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام کی مذکورہ تعریف جو آجکل بہت زیادہ رائج ہے وہ بذات خود درست نہیں۔ یہ تمام تر ردعمل کا نتیجہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی معاملات میں چرچ کے دخل کو ختم کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس کے ردعمل میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ یہ کہنے لگا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہاں تیسری تھی۔ یعنی یہ کہ مذہب معرفت خداوندی کا نام ہے اور انسان کو جب خالق و مالک اور محاسب ومجازی خدا کی معرفت ہو جائے تو اس کے اندر ایک ذہنی انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری معاملات میں اللہ کی پسند و ناپسند کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔

جن لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے، ان کی تعریف کم از کم محدود حد تک انسانی شخصیت کو چھوتی تھی۔ مگر جدید مسلم مفکرین کی تعریف میں انسانی شخصیت سرے سے گرفت سے باہر چلی گئی۔ اس نظریہ کو ماننے والوں کا سارا دھیان حکومتی ادارہ کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ ان کی تعریف کے مطابق یہ صرف حکومتی ادارہ تھا جس کو قبضہ میں لے کر زندگی کے تمام شعبوں کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کی جا سکتی تھی۔

ایک بوڑھے انگریز سے بات ہوئی۔ وہ انڈیا کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ انڈیا

سے مجھے دلچسپی ہے۔ ایک بار میں نے انڈیا کی سیاحت بھی کی ہے۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ عقلی نقطۂ نظر اور علمی طرزِ فکر کے معاملہ میں ہندستانی ذہن یورپی ذہن سے بہت پیچھے ہے :

The Indian mind is far less rational and scientific than the European.

مذکورہ انگریز کی اس بات کو میں رد نہ کر سکا۔ کیوں کہ میرا اپنا خیال بھی ہندستانی ذہن کے بارہ میں یہی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پورے برصغیر ہند کی اصل کمی یہی ہے۔ انڈیا کے لیڈروں نے اصل مسئلہ سیاسی آزادی کو سمجھا۔ پاکستانی لیڈروں نے مسلم پاکٹ بنانے کو اصل مسئلہ قرار دیا۔ بنگلہ دیش کے لیڈروں نے یہ سمجھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان اور بنگلہ تہذیب کو ایک آزاد علاقہ حاصل ہو جائے۔

مگر میرے نزدیک یہ سب کی سب سطحی سوچ تھی۔ یہ سب قیادت سازی کے نظریے ہیں، وہ قوم سازی کے نظریے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خیالات کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکوں نے کچھ لیڈروں کے گنبد تو ضرور کھڑے کر دئے۔ مگر یہ تحریکیں قوم کا مستقبل تعمیر کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔

لندن کی ایک مجلس میں بوسنیا میں ہونے والے مظالم کا ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے پرجوش طور پر کہا کہ عراق نے کویت کے خلاف ظلم کیا تو امریکی حکومت فی الفور پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ بوسنیا میں سرب اور یوگوسلاوی حکومت نے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ مگر امریکہ کی حکومت نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بش انتظامیہ کے نزدیک صرف ان مسلمانوں کی اہمیت ہے جن کے پاس تیل ہو :

It would appear that only Muslims with oil count for the Bush administration.

میں نے کہا کہ اس معاملے میں خود مسلمان ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند کا مصداق ہیں۔ صدام حسین نے کویت کے خلاف جارحیت سے پہلے ایران کے خلاف جارحیت کی اور اور اس کو ۸ سال تک جاری رکھا، مگر ہمارے علماء اس جارحیت پر خاموش رہے۔ لیکن جب اسی صدام نے کویت (اور سعودی عرب) کے خلاف جارحیت کی تو تمام علماء چیخ اٹھے۔ کیوں کہ سعودی عرب اور کویت سے ان علماء کا مفاد وابستہ تھا۔ جب کہ ایران سے ان کا اس قسم کا مفاد وابستہ نہیں۔

ایک پاکستانی جریدہ" اخبار اردو" میں ڈاکٹر منت اللہ الدین احمد کا ایک مضمون پڑھا۔ وہ بریڈ فورڈ میں رہتے ہیں۔ وہ طبی پیشہ کے ساتھ شعروادب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ "اس وقت برطانیہ میں جس قدر مشاعرے ہوتے ہیں، شاید پاکستان میں بھی نہیں ہوتے۔ لندن، برمنگھم آکسفورڈ، مانچسٹر، بریڈفورڈ، گلاسگو، اڈنبرا اور ناٹینگھم جیسے برطانی شہروں میں کئی کئی ادارے اور ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ یہ کسی نہ کسی موضوع پر جلسے، مذاکرے اور مشاعرے منعقد کراتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون برطانیہ، بالخصوص پاکستان سے بلائے اور بن بلائے شاعر اور ادیب اور اہل قلم تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے یا ادبی تقاریب منعقد ہوتی ہیں"۔

ڈاکٹر اقبال ۱۹۰۵ میں یورپ گئے۔ وہاں وہ تعلیم کے سلسلہ میں انگلینڈ اور جرمنی میں ۱۹۰۸ تک رہے۔ اس قیام کے دوران انھیں احساس ہوا کہ یہ زمانہ شعروشاعری کا نہیں ہے۔ بلکہ سائنس کا ہے۔ انھوں نے شاعری کو چھوڑنے کا ارادہ کیا اور اپنے دوست سر عبد القادر (مدیر مخزن) کو ایک منظوم خط میں لکھا:

مدیر مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

مگر اقبال کے دوستوں نے اصرار کرکے انھیں شعرگوئی کے مشغلہ پر باقی رکھا۔ عجیب بات ہے کہ تقریباً نوے سال بعد بھی مسلمان یورپ تک میں شعروشاعری کے مشغلہ کو بدستور اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کے محبوب رہنما (اقبال) شاعری کو بے فائدہ سمجھنے کے باوجود اس کو چھوڑنے پر اپنے آپ کو راضی نہ کر سکے تھے۔

ایک برطانی تاجر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ برطانیہ میں (اور پوری مغربی دنیا میں) دکھائی دے رہا ہے کہ جاپان نے اقتصادی حملہ کر رکھا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی سپر یمیسی کو چھین رہا ہے ۱۹ ویں صدی کو برٹش صدی کہا جاتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی امریکی صدی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی جاپانی صدی ہوگی۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ امریکہ میں جاپان کو دشمن نمبر ایک کہا جانے لگا ہے۔ جاپان کی پر کیپٹا جی این پی امریکہ سے ۲۲ فیصد زیادہ ہے۔ اور اسی طرح برطانیہ سے بھی اس کا ٹریڈ سرپلس ۱۲۰ بلین سالانہ ہے۔ اس طرح کی کچھ باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں خود جاپان گیا ہوں۔ اور اس کو قریب

سے دیکھا ہے۔ میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب ایجوکیشن ہے۔

The educational achievements of Japanese workers at all levels are unmatched in the world.

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی تحریروں میں اختلاف رائے اور تنقید بہت ہوتی ہے۔ یہاں کے کچھ لوگ کہنے لگے ہیں کہ آپ کو تنقید کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ آپ کسی بھی مہینہ کے الرسالہ کو اٹھا کر دیکھئے اور ہر مضمون کو پڑھ کر پتہ کیجئے کہ اس میں اختلاف رائے والا پہلو کتنا ہے۔ آپ پائیں گے کہ کسی پرچہ میں سرے سے ایسا کوئی مضمون نہ ہوگا اور کسی میں ہوگا بھی تو صرف ایک یا دو فیصد۔

پھر میں نے کہا کہ اصل مسئلہ اختلاف رائے نہیں ہے۔ اصل مسئلہ لوگوں کی غیر ضروری حساسیت ہے۔ صحابہ کے زمانہ سے لے کر ہر اگلے دور تک علماء کے درمیان اختلاف ہوتا تھا مگر کبھی کسی نے اختلاف کو برا نہیں بتایا۔ مثلاً امام محمد اور امام ابو یوسف دونوں امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے۔ دونوں نے امام ابو حنیفہ کی رایوں سے ۸۲ معاملہ میں اختلاف کیا ہے۔ مگر اس کو کبھی کسی نے برا نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف رائے یا علمی وفکری تبصرہ قوموں کی زندگی ہے۔ اس کو اسلام میں اتنا زیادہ جگہ دی گئی ہے کہ آدم کی پیدائش کی کہانی کا ایک جزء جو بائبل میں حذف ہوگیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج فرمایا۔ یہ خود اللہ تعالیٰ سے فرشتوں کا یہ کہنا تھا کہ اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء (البقرۃ ۳۰)

ایک صاحب نے تنہائی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جب کمرہ کے اندر تنہا ملاقات ہوئی تو وہ اپنے گھریلو حالات بتاتے ہوئے رونے لگے۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر دیکھنے میں ٹھیک معلوم ہوں گے لیکن اگر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ لوگ سخت الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ کہیں باپ اور بیٹے کے درمیان کش مکش، کہیں شوہر اور بیوی کے تعلقات میں بگاڑ، کہیں ساس اور بہو کے درمیان جھگڑا۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ مسلمانوں میں اتنی شدت کے ساتھ ان مسائل کے پیدا ہونے کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسلوں کو دو سو برس سے صرف ایک ہی

تعلیم دی جا رہی ہے، اور وہ جہاد ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف جہاد کو گلوریفائی کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی بھی نہیں جو صبر، اعراض اور مفاہمت کی قدروں کو جاننے اور اس کو امت کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ جہاد اور ٹکراؤ ہے۔ چنانچہ آدمی جب کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے، خواہ وہ گھر کے باہر ہو یا گھر کے اندر، تو فوراً جہادی تدبیریں اس کے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس صورت کو بدلا جائے اور لوگوں کو صبر و اعراض اور حسن تدبیر کی قدروں سے آشنا کرایا جائے۔

برمنگھم میں علماء کی ایک مجلس میں ایک بزرگ نے سوال کیا کہ اردو خواں طبقہ یا انگریزی خواں طبقہ میں تو آپ کا مشن پھیل رہا ہے۔ عرب دنیا میں اس کو کس حد تک قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پچھلے چند سالوں میں عرب نوجوانوں میں یہ مشن تیزی سے پھیلا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اسی لئے میں یہاں سے قاہرہ جا رہا ہوں۔ کیوں کہ وہاں عرب نوجوان جمع ہوں گے۔ انھوں نے شدت سے اس کی خواہش ظاہر کی ہے۔

میں کہا کہ عرب نوجوانوں میں اس مشن کے پھیلنے کی خاص وجہ ہے۔ آپ لوگوں کو اگر عرب دنیا کے داخلی حالات کا علم ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی سیاسی تفسیر عرب دنیا میں تیزی سے پھیلی۔ اس کے نتیجہ میں عرب دنیا کے اسلام پسندوں اور وہاں کی حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ کیوں کہ سیاسی اسلام کا نظریہ براہ راست طور پر موجودہ عرب حکمرانوں کے نظام سے ٹکراتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر عرب ملک میں "اسلام پسند" حضرات کی تعذیب شروع ہو گئی جو تا حال جاری ہے۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں عرب نوجوانوں کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب رہ گیا تھا۔ یا تعذیب یا منافقت۔ اگر وہ اپنے نظریہ کے مطابق رہنا چاہیں تو حکمرانوں کے شدید عتاب کا شکار بنیں۔ اور اگر اپنے نظریہ کو اپنے اندر چھپائیں تو منافق بن کر زندگی گزاریں۔ اس کے بعد جب ان کا تعارف الرسالہ مشن سے ہوا تو ان پر منکشف ہوا کہ ہم کو نہ عذاب سہنے کی ضرورت ہے اور نہ منافق بننے کی۔ خیر الامور اوسطہا کے اصول کے مطابق یہاں ان کے لئے ایک تیسری صورت

موجود ہے جو زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ وہ الرسالہ مشن کو دل وجان سے قبول کر رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں، اس کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ گفت گو رات کے وقت ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ بظاہر اس وقت اندھیرا ہے، مگر دوسرا اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ پورا کائناتی نظام اس اندھیرے کو ختم کر کے دوبارہ صبح طلوع کرنے کی طرف متحرک ہے۔ پھر آپ اندھیرے کے خلاف احتجاج کیوں کریں۔ آپ آنے والی صبح کو سوچ کر اللہ کا شکر کیوں نہ کریں۔

میں نے کہا کہ اس دین کے ساتھ اللہ نے محفوظیت (الحجر ۹) کا معاملہ کیا ہے۔ اس معاملہ کی نشانیاں آپ ساری تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا چاہا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود تاتاری دین کے خادم بن گئے۔ بیسویں صدی میں اتاترک اور عصمت انونو نے ترکی سے اسلام کو ختم کرنا چاہا۔ مگر دو نسلوں تک حکومت کی ساری طاقت ختم کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت انونو (۱۹۷۳-۱۸۸۴) نے انتقال کے وقت کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ عجیب چیز دیکھی کہ ہم نے ترکی میں سیکولرزم کا پودا بویا مگر جب پھل نکلا تو وہ اسلام تھا۔

یہی معاملہ ہندستان میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں نے انڈیا سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ساری کوششوں کے بعد یہ حال ہوا کہ ۱۹۴۷ میں غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ تھی۔ آج اسی ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چوگنا ہو چکی ہے۔ میوات میں کچھ جاہل مسلمان تھے جو چوٹیاں رکھتے تھے اور ہندو رسوم مانتے تھے۔ ہندوؤں نے ان کو شدھی کر کے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی دینی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ آج یہ حال ہے کہ نہ صرف میواتیوں کی دینی اصلاح ہوئی بلکہ مولانا الیاس صاحب کی اٹھائی ہوئی تحریک ایک عالمی اصلاحی تحریک بن گئی۔ تقسیم کے بعد کچھ ہندوؤں نے اجودھیا کی بابری مسجد پر قبضہ کر کے

کوشش کی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ اجودھیا کی مسجد میں ہندوؤں کو داخلہ کا موقع اس لئے ملا کہ وہ غیر آباد تھی۔ کیوں کہ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ اس احساس نے دوسری مسجدوں کی آبادی کا ذہن پیدا کیا۔ آج ہندستان کی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں مزید بہت زیادہ آباد اور پر رونق ہو چکی ہیں۔

پھر جب حالت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش برعکس طور پر خود اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے تو ہم کو لوگوں کی سازش پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

جیرل ہرسٹ کے پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد نیوہیم نارتھ (Newham North) کے لئے روانگی ہوئی۔ اس سفر کے درمیان لندن کا مشہور دریائے ٹیمز پڑتا ہے۔ اس دریا کے نیچے سے لمبی سرنگ بنا کر راستہ نکالا گیا ہے۔ اس کے اندر سے ہماری گاڑی گزری تو عجیب احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسی کیسی قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ نہ صرف دریا کے اوپر کشتی کے ذریعہ سفر کرتا ہے۔ بلکہ دریا کے نیچے سے سڑک نکال کر خشکی کا راستہ بنا سکتا ہے۔ اوپر دریا بہہ رہا ہے اور نیچے سے کاروں کے قافلے گزر رہے ہیں۔

۲۷ ستمبر کی صبح کو ہم گھر سے نکلے کہ نیوہیم نارتھ (گرین اسٹریٹ) کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھیں۔ یہ صبح ۶ بجے کا وقت تھا۔ وہاں پہنچے تو اس کے دونوں دروازوں پر تالا لگا ہوا تھا۔ اوپر انگریزی میں لکھا ہوا بورڈ دکھائی دے رہا تھا: دی مسلم کیمونٹی سنٹر۔ کچھ دیر تک سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کیا کہ شاید کوئی صاحب آرہے ہوں اور مسجد کا دروازہ کھولیں۔ مگر کوئی صاحب نہیں آئے۔ چنانچہ واپس آکر اپنی قیام گاہ پر فجر کی نماز ادا کی۔

۲۷ ستمبر کو اتوار کا دن تھا۔ صبح ہوئی تو مجھے سو سال پہلے کی انگریزی کتاب یاد آئی جس کو میں نے تقریباً پچاس سال پہلے پڑھا تھا۔ یہ بچوں کی کتاب تھی۔ اس میں لندن کی صبح کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے گئے تھے ـــــ لندن کے گھنٹے بجنے لگے:

The bells of London begun to ring.

میں نے سننے کی کوشش کی تو لندن کے گھنٹوں کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ البتہ اس کے بجائے سڑک سے گزرنے والی کاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لندن کے یہ گھنٹے

لندن کے چرچ کے گھنٹے تھے۔ سو سال پہلے صبح کے وقت سب سے زیادہ عام آواز یہاں کے چرچ کے گھنٹوں کی آوازیں تھیں۔ مگر صنعتی دور نے حالات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب عبادت خانوں کی اہمیت گھٹ گئی اور اس کے بجائے مشینوں کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔

لندن میں چھوٹی بڑی تقریباً ۱۰۰ مسجدیں ہیں۔ میری قیام گاہ کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس سے بالکل متصل ایک مکان تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ مکان ایک انگریز کا تھا۔ وہ مکان بیچنا چاہتا تھا۔ کئی انگریز اس کو خریدنے کے لئے آئے۔ انھیں میں سے ایک مسلمان بھی تھا جو مسجد کی توسیع کے لئے اس مکان کو خریدنا چاہتا تھا۔ انگریز نے اپنے ہم قوموں کو مکان نہیں دیا۔ اس نے اپنا مکان مسجد والوں کو دے دیا اور کہا کہ آپ لوگ اس کو مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کریں۔ یہ میرے لئے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ میرا مکان آئندہ ایک عبادت خانہ کا حصہ بن جائے۔ میں نے خود جا کر اس مسجد اور اس مکان کو دیکھا۔

لندن میں مجھے بون (جرمنی) سے مسٹر فاروق جنگ کا ٹیلی فون ملا۔ انھوں نے پہلے ہی سے اس سفر میں مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ بروسیلز سے بذریعہ کار مجھ کو بون لے جائیں۔ مگر بعض وجوہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔

ذاتی طور پر میں جرمنی جانے کا خواہش مند تھا۔ خاص طور پر میں برلن وال کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اب ٹوٹ کر ختم ہو چکی ہے۔ برلن وال ایک سو میل لمبی تھی جو مشرقی برلن کو مغربی برلن سے جدا کرتی تھی۔ سیمنٹ اور کنکریٹ سے سابق سوویت یونین کے زیر حکم بنائی گئی تھی۔ ونسٹن چرچل نے اس کو آہنی پردہ (Iron Curtain) کا نام دیا تھا۔ برلن وال اگست ۱۹۶۱ میں بنائی گئی تھی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مشرقی جرمنی سے بھاگ کر مغربی جرمنی میں داخل ہونے والوں کو روکا جائے:

It was built in August 1961, mainly with the aim to contain the massive exodus of East Germans to the West.

مگر ۹ نومبر ۱۹۸۹ کی رات کو برلن وال ہمیشہ کے لئے توڑ دی گئی۔ حتی کہ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کی تقسیم بھی ختم ہو گئی۔ دونوں مل کر ایک ملک بن گئے اور ایک حصہ کے لوگوں کے لئے دوسرے حصہ کی طرف جانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۰۱

۱ ایک کانفرنس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اگست ۱۹۹۴ میں برطانیہ کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں لندن، مانچسٹر، برمنگھم، کارڈف، برسٹل وغیرہ میں مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲ مولانا بشیر احمد راشد الامینی (مہتمم مدرسہ معین الاسلام، نئی دہلی) الرسالہ کے بارہ میں اپنے تاثرات بتاتے ہوئے ایک مفصل خط میں لکھتے ہیں: الرسالہ ایک ماہنامہ نہیں بلکہ وہ ایک مشن ہے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے ایک دینی مشن زبانی چلایا تھا، اسی دینی مشن کو آپ نے قلم میں بدل دیا ہے۔

۳ پی ٹی آئی کی نمائندہ مسز الینا نے ۲۳ اگست ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر فیملی پلاننگ اور ستمبر میں قاہرہ میں ہونے کانفرنس سے تھا جو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام پاپولیشن اینڈ ڈولپمنٹ کے موضوع پر ہو رہی ہے۔

۴ الرسالہ کا مشن خالص تعمیری مشن ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سے متاثر حضرات جگہ جگہ تعمیری اور تعلیمی منصوبوں میں سرگرم ہو رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نو مسلم ایجوکیشن سوسائٹی (سہارنپور) بھی ہے۔ یہ رجسٹرڈ ادارہ خصوصیت سے تعلیم کے میدان میں اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک اقدام نیشنل یونانی میڈیکل کالج کا قیام ہے۔

۵ جواہر بھون (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک میٹنگ ۲۴ اگست ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کا موضوع "قومی تعمیر اور اقلیتیں" تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔

۶ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر مہاراج کرشن بھرت نے ۲۵ اگست ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسٹر انور شیخ کی کتاب اٹرنیٹی (Eternity) سے تھا جو انھوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہے۔ بتایا گیا کہ مصنف کا مطالعہ اسلام کے بارہ میں بہت کمزور ہے۔ انھوں نے بہت زیادہ غلطیاں کی ہیں۔

۷ بی بی سی کے نمائندہ مسٹر قربان علی نے ۲۶ اگست ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو

ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر قاہرہ میں ستمبر ۱۹۹۴ میں ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس سے تھا۔ یہ کانفرنس آبادی اور انسانی ترقی کے موضوع پر ہو رہی ہے۔ بتایا گیا کہ مالتھس کا نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور آبادی میں اضافہ کسی بھی درجہ میں انسانی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے۔

نیو انڈیا موومنٹ کے تحت ۲۸ اگست ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ نئی دہلی (ہیلی روڈ) میں ہوئی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندستان کی تعمیر نو کے موضوع پر تقریر کی۔

چنتک منڈل (نئی دہلی) کی ایک میٹنگ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کمیٹی روم میں ۲ ستمبر ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا موضوع تھا: ذات پات اور ملکی ترقی۔

ادھیاتما سادھنا کیندر (مہرولی) میں تھنک ٹینک کا اجلاس اچاریہ تلسی کی صدارت میں ۳ ستمبر ۱۹۹۴ کو ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع تھا: ملک میں نیشنل کیرکٹر کیسے پیدا کیا جائے۔ اس موضوع پر اسلام کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کیرکٹر بلڈنگ کا پراسس ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے یہ کام مذہبی پیشوا کرتے تھے۔ اب مذہبی پیشوا ہندوؤں میں آشیرواد کے لئے اور مسلمانوں میں برکت کے لئے رہ گئے ہیں۔ اب وہ معلم اخلاق نہیں ہیں۔

اٹلی کے شہر اسیسی میں ۱۱-۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع عالمی امن کا مسئلہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ ۱

رشی کیش کے انٹرنیشنل آشرم پرمارتھ نکیتن نے اسلامی مرکز سے کہا ہے کہ وہ اسلام پر تین سو صفحہ کی ایک (Islam in daily life) کے نام سے تیار کر کے دے جس کو وہ دس زبانوں میں چھاپ کر عالمی سطح پر پھیلائیں گے۔ انڈیا کے مشہور اشاعتی ادارہ بھارتیہ ودیا بھون نے بھی اسلامی مرکز سے اسلام پر ایک کتاب مانگی ہے جس کو وہ (Primer of Islam) کے نام ۱۲

سے چھاپ کر شائع کریں گے۔ اسی طرح ناگپور کے ایک سماجی ادارہ انڈیا پیس سنٹر نے اسلامی مرکز سے کہا ہے کہ وہ اسلام پر ایک کتاب (Social teachings of Islam) کے نام سے تیار کر کے دے جس کو وہ اپنے اہتمام میں چھاپ کر اسکولوں اور لائبریریوں کو فراہم کریں گے۔

۱۳ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے سب اڈیٹر مسٹر ستیش نرائن سنگھ نے ۵ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دنیا کا نظام عملی تقاضوں پر چلتا ہے۔ اس لئے آدمی کو ذاتی معاملہ میں آئیڈیلسٹ ہونا چاہئے مگر اجتماعی معاملات میں اس کو پریکٹیکل بن جانا چاہئے۔

۱۴ بی بی سی لندن کے نمائندہ مسٹر آصف جیلانی نے ۶ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد کی مسماری کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان جس طرح برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں اسی طرح ہندستان میں بھی رہنے لگیں تو ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

۱۵ ریاض کے عربی ماہنامہ المسلمون کے نمائندہ دکتور عبد اللہ العویسی اور استاذ عمار بکار نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ یہ انٹرویو مکمل طور پر المسلمون کے شمارہ ۹ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ (۲ مئی ۱۹۹۴ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کے چند عنوانات یہ ہیں: لیس هناك صحوة اسلامية بل صحوة قومية۔ روح الاسلام تكمن في الاتحاد مع الاختلاف۔ الجمود الفكري اخطر مراحل التخلف۔ واجهتنا المشاكل عند ما قصرنا في الدعوة۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۴ میں صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں شہر کے مختلف علاقوں میں کئی دعوتی اور تربیتی میٹنگیں ہوئیں۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعہ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	.
کتاب زندگی	40/-
انوار حکمت	.
اقوال حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	.
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرہویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعدد ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

	-
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسولؐ	25/-
میدان عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقت روزہ	150/-

AL-RISAL BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333